پتھر کردو آنکھ میں آنسو



مِصباح مُشتاق

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام



پتھر کر دو آنکھ میں آنسو

مصباح مشتاق

انتساب

اپنی پیاری فیملی کے نام

اور

اقراء تمھارے لیئے

"آپ سب کے پیار اور حوصلہ افزائی نے مجھے
میرے اندر کے اُجالوں سے روشناس کرایا، میں آپ
سب کی محبتوں کے بغیر کچھ بھی نہیں۔"

پیش لفظ

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان ہر طرح سے اپنے جذبات کا اظہار کر کے بھی پُرسکون نہیں ہوتا اُسے لگتا ہے کہ ابھی بھی کوئی تشنگی، کوئی چبھن دل کے کسی کونے میں باقی ہے کچھ ایسا ہی میرے ساتھ ہے میں نے شاعری کا آغاز بہت چھوٹی عمر سے کیا۔ کچھ کتابوں (انتخاباب) کے بعد، پہلی کتاب ''اُس نے کہا تھا الوداع'' شائع ہوئی۔ لیکن اس کتاب کے بعد بھی میرے اندر ایک عجیب سی کشمکش تھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کتنے ہی کردار میرے ذہن میں قید ہیں۔ مجھے اپنے لفظوں کا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا تو میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اس کہانی کو تحریر کرنا شروع کیا۔ مجھے نہیں پتہ میرے ربّ نے کب اور کیسے میرے قلوب و اذہان کو اتنی جلا بخشی کہ مجھے کئی بار خود پر لفظوں کا نزول ہوتا محسوس ہوا۔

اگر میں کہوں کہ الحمدللہ یہ میرے اللہ کی عطا ہے یہ جو اُس نے اتنا نوازا ہے
کہ میرے لفظوں میں احساس پیدا کیا، جسے لوگ محسوس کر سکتے ہیں

اور یہ کہانی "پتھر کر دو آنکھ میں آنسو" جس کے سب کردار شب و روز ہمارے اردگرد گھومتے ہیں۔ کبھی ہم اُن کے درد کو محسوس کر لیتے ہیں اور کبھی ہم خودغرض بنے تماشا دیکھتے ہیں۔

کبھی ہمارے اندر احساس کوٹ کوٹ کر بھر دیا جاتا ہے اور کبھی ہماری بے حسی ہماری ہی بے بسی پر ہنستی ہے۔ ادیبا عمر وہ کردار ہے جو ہمارے معاشرے کی 90% لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے کی عورت اتنی ہی وفادار اور محبت کرنے والی ہے کہ اپنے ٹوٹے رشتوں کی کرچیاں بھی سنبھال کر رکھتی ہے۔ لیکن اس معاشرے کا ایک المیہ یہ ہے کہ یہاں عورت کی وفاداری، اُسکی پُرخلوص بے پناہ چاہتوں کو اُس کی سب سے بڑی کمزوری سمجھا جاتا ہے اور افسوس یہی سب سے بڑا المیہ بھی نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

جیسے کہ یہ میرا پہلا ناول ہے اور میں نے انتہائی کوشش کے باوجود ضرور بہت سی غلطیاں بھی کی ہوں گی لیکن اگر میرے لفظوں نے واقع ہی آپ کے دل کو چھوا ہے تو مجھے اُمید ہے آپ میری غلطیوں کو سدھارنے کا مجھے ایک اور موقع ضرور دینگے۔ تا کہ میں ناول نگاری میں کچھ اور بھی کہانیاں اپنے پڑھنے والوں کے لیے لکھ سکوں۔

اور آخر میں، میں سب کی تہہ دل سے مشکور ہوں کہ آپ سب نے اپنے قیمتی وقت میں سے اس ناول کو پڑھنے کا وقت نکالا اور اب مجھے بہت

شدت سے آپ سب کی آراء کا انتظار ہے تا کہ میں ایک نئی کہانی کو بہت بہتر طریقے سے ترتیب دے سکوں۔

میرے والدین، میری سب فیملی، دوست، احباب سب کا تہہ دل سے شکریہ، مجھے ہر مقام پر support کرنے کے لیے۔ حوصلہ ہو تو انسان طوفانوں سے ٹکرا جاتا ہے اور جو حوصلے مجھے میرے سب چاہنے والوں سے ملے ہیں ان کی بنیاد پر میں نے اپنے احساسات سے ٹکر لی ہے۔ اُنہیں لفظوں کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

اس ناول کو online لانچ کرنے کے لیے میں نے www.urdunovelsonline.com کی مدد لی اور مجھے "جاوید اقبال" اور "ریان مرزا" نے جتنے اچھے طریقے سے گائیڈ کیا اور support کیا۔ اُس کے لیے میں اُن کی تہہ دل سے مشکور ہوں۔ ان شاء اللہ جلد ہی یہ ناول، آپ سب کے لیے کتاب کی صورت میں بھی available ہوگا۔ ان شاء اللہ۔ اللہ آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

آپ کی آراء کا منتظر

مصباح مشتاق

misbahmushtaq21@gmail.com

https://www.facebook.com/Pathar-Kar-Do-A

☆

اپنے کمرے میں لیٹی وہ بہت دیر تک چھت کو گھورتی رہی۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبی وہ اپنی زندگی کا تفصیلی جائزہ لے رہی تھی۔ اُس کی سوچوں کا ماضی سے ایک مسلسل ربط تھا۔ ایک ایسا کنکشن جو کبھی منقطع نہ ہوتا تھا، کبھی کبھی کچھ رابطے بہت مہنگے پڑ جاتے ہیں۔ انسان کو نا چاہتے ہوئے بھی اُس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ سب کچھ ایک فلم کی طرح اُس کے ذہن میں چلتا رہا۔ وہ کبھی آنسو صاف کرتی، کبھی خود کو تسلیاں دیتی۔

ادیبا گھر میں سب سے چھوٹی تھی دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، ماں اور باپ دونوں کی ہی انتہائی لاڈلی اور بھائیوں کی تو جیسے پوری دنیا اُسی کے گرد گھومتی تھی۔ عمر حیات کے گھر کی رونق تھی ادیبا۔ اسی لیے وہ عام لڑکیوں سے کچھ زیادہ نازک مزاج اور انتہائی حساس تھی۔ اُس کے لیے دنیا میں جیسے ایک ہی جذبہ تھا اور وہ تھا محبت کا۔ زندگی نے اُسے صرف خوشی کا رنگ دکھایا تھا۔ اس کے لیے کسی کے درد کو محسوس کرنا قدرے مشکل کام تھا، کیوں کہ جن جذبوں سے آشنائی نہ ہو، بعض اوقات انھیں محسوس کرنے میں وقت لگتا ہے۔

لیکن ادیبا کو وقت نے اتنی بھی مہلت نہ دی اور زندگی نے اُسے اپنے وہ رنگ بھی دکھا دیے، جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔

پانچ سال پہلے رونما ہونے والا حادثہ اُس کی پوری شخصیت کو یکسر بدل گیا تھا۔ کبھی وہ ایسی ادیبا تھی کہ جس کی ہنسی سے پورا گھر مسکراتا تھا، وہ جس سمت چلتی، یوں لگتا کہ جیسے بہاروں نے اپنا رُخ موڑ لیا ہو۔ ایک حصار سا تھا، جو سب کو اُس کی گرفت میں کر لیتا۔ وہ بات کرتی، تو یوں لگتا کہ جیسے ساری کائنات محو ہو۔ جتنا پُرنور چہرہ تھا اس کا، ویسی ہی وہ دل کی بھی صاف تھی۔ معصومیت کا پیکر اور حُسن تو جیسے اُس کے چہرے کا طواف کرتا تھا۔ جو بات ادیبا کو اور بھی حسین بناتی، وہ یہ تھی کہ اتنی خوبصورت ہونے کے باوجود وہ غرور سے یکسر بے نیاز تھی۔ جس عاجزی سے وہ مخاطب ہوتی، یوں لگتا کہ جیسے اب یہ کسی کی جان بھی مانگ لے، تو کوئی انکار کر ہی نہ پائے گا۔

لیکن بُرا وقت ایک ایسی ظالم چیز ہے جس کو آپ کی صفات سے غرض ہی نہیں ہوتی، جو اذیتیں وہ آپ کے حصے میں لکھ کے بیٹھا ہے، اُسے تو بس آپ کی باری کا انتظار ہے کہ آپ کو آپ کا حصہ ادا کرے اور اپنے فرض سے فارغ ہو جائے۔ اُسے اس سے یکسر کوئی مطلب نہیں کہ آپ کتنے ٹکڑوں میں تقسیم ہوں گے، ان اذیتوں کو اٹھاتے اٹھاتے کتنی بار فنا بقا سے گزریں گے۔

"ادیوا! تم جاگی نہیں اب تک؟ دیکھو میں ناشتہ یہیں لے کر آیا ہوں چلو اُٹھ جاؤ اب جلدی سے۔"

یہ اشعر تھا، جو ادیوا کا سب سے بڑا بھائی تھا اور اُس کا دل و جان سے خیال رکھتا تھا۔

ادیوا نے اشعر کی آواز سنتے ہی بستر میں چہرا چھپا لیا۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کی آنکھوں سے رات بھر رونے اور جاگتے رہنے کے آثار صاف نمایاں تھے اور وہ اس دُکھ کی شدت سے بھی واقف تھی، جو اشعر کو اُس کی یہ حالت دیکھ کر محسوس ہوتا۔ لہٰذا اس نے دبے لہجے میں کہا۔

"بھائی! مجھے تھوڑی دیر سونے دیں۔ میں اس وقت کچھ کھانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

اشعر نے یہ جواب سن کر زیادہ اصرار نہیں کیا، کیوں کہ وہ ادیوا کو جانتا تھا کہ وہ ضد کی کتنی پکی تھی۔

کچھ دیر کے بعد وہ اُٹھی، آئینے میں خود کو دیکھا اور سوچنے لگی۔

"کتنا بدل دیا تھا وقت نے اُسے۔"

پہلے بھی وہ آئینہ دیکھتی، تو دل میں فوراً ایک ہی دعا کرتی۔

"اے اللہ! میرے اندر بھی اتنا ہی نور بھر دے جیسا تو نے میرا چہرہ روشن رکھا ہے۔"

اور اب وہ وہی ادیوا تھی ہی نہیں، کتنی تھکن کے آثار تھے اس کے چہرے پہ، کتنے کرب تحریر تھے اور آنکھیں صدیوں کی تھکی، نا جانے کتنے ہی سالوں کے رتجگے ڈیرے ڈالے بیٹھے تھے۔ اب وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی آنکھوں کی مدہم اُداس روشنی کو نظر انداز کرنے لگی دل آج بھی ویسے ہی دعا کو تھا مگر اب بس اتنا کہہ پاتا۔

"اے اللہ! میری روح کو تاریکیوں سے بچالینا۔"

روح کی تاریکیاں بہت ہی اذیت ناک ہوتی ہیں۔ انسان کو خود میں پنہاہ جلوے بھی دکھائی نہیں دیتے، جو اُس کے رب نے اسے عطا کیے ہیں اور سب وسیلے، سب واسطے ان تاریکیوں میں دفن ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اب وہ اور زیادہ اپنے اندر کے اُجالوں کی دعا کرتی۔ ابھی وہ انھی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور مسز عمر اندر آئی۔

"ماما جانی! میں بس آنے ہی والی تھی۔"

ان کے بولنے سے پہلے ہی اس نے کہہ دیا۔

"آپ چلیں ...... میں بس فریش ہو کر آئی۔"

ادیوا نے قدرے جھجکتے ہوئے لہجے میں کہا اور وہ جیسے ہی یہ کہہ کر مڑنے لگی، اچانک اسے اس کا ہاتھ ماں کی گرفت میں محسوس ہوا اور وہ ادیوا کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔

"اویا! مجھے پتہ ہے، تمھارے لیے وہ اذیت، وہ وقت بھلانا بہت مشکل ہے، مگر بیٹی! وقت رک تو نہیں جاتا، سب کچھ اپنے معمول پہ ہے۔ بس دیکھو! تو تم ہی پیچھے رہ گئی ہو۔ ذرا آئینہ دیکھو! کیا حال کر دیا ہے تم نے اپنا۔"

اب ان کی آواز بھر آئی تھی۔ مشکل سے آنسو روکتے ہوئے بس اتنا ہی کہہ پائیں۔

اویا کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ یہی سب کچھ پچھلے پانچ سال سے سنتی آ رہی تھی اور شاید اسی لیے اب اس کے پاس بھی کوئی نئی تسلی نہیں تھی، جس سے وہ اپنی ماں کو بہلا سکتی۔ کبھی کبھی زندگی اتنے مشکل موڑ پہ لے آتی ہے کہ انسان چاہ کے بھی اپنے پیاروں کو خوشیاں نہیں دے سکتا اور اسی بے بسی میں وہ سر ہلاتے ہوئے واش روم چلی گئی۔

اُسے بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب اس زندگی کے ساتھ وہ کیا سلوک کرے، اُس کے پاؤں میں جیسے کئی بیڑیاں ایک ساتھ ڈال دی گئی تھیں۔ ایک طرف بے پناہ محبت کرنے والے رشتے تھے کہ جن کی تمام تر خوشیاں اُس کے ہی دم سے تھی اور ساتھ یہ کہ ڈپریشن میں اُٹھایا گیا کوئی انتہائی قدم اور اُس کے نتیجے میں اللہ کی ناراضی کا ڈر، یہ دونوں مسلسل اُس کے اعصاب پہ سوار رہنے والے خیالات تھے ورنہ وہ زندگی کے ساتھ بھی ویسا

ہی سلوک کرنا چاہتی تھی، جو زندگی نے اُس کے ساتھ کیا تھا، بدلہ لینے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی وہ بے بس تھی۔

''ادیوا! ناشتہ کر کے تیار ہو جاؤ۔ آج ہم کچھ دن کے لیے مری جارہے ہیں، تمھارے پاپا نے وہی ریسٹ ہاؤس بک کروایا ہے، جو تمھیں لاسٹ ٹائم بہت پسند آیا تھا اور اچھا ہے تمھاری آؤٹنگ ہو جائے گی، ویسے بھی پورا دن اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہو۔ تمھارے پاپا بہت پریشان ہیں تمھارے لیے۔''

ادیوا جانتی تھی کہ صرف پاپا ہی نہیں اُس کے لیے گھر کا ہر فرد پریشان تھا۔

''جی ماما! میں پیکنگ کرتی ہوں۔''

یہ کہہ کر اُس نے چائے کا کپ اُٹھایا اور کمرے میں آگئی۔

یہ تو ادیوا جانتی تھی کہ مری جانے کے سفر سے لے کر وہاں رہنے تک کا سارا وقت کسی کربِ مسلسل سے کم نہیں ہوگا۔ ایک وہ وقت تھا کہ ایسی جگہوں سے عشق تھا اُسے، قدرتی مناظر دیکھ کر زندگی اور بھی خوبصورت لگنے لگتی تھی۔ شاید ہی اُس کی زندگی میں کوئی ایسا موقع جو اُسے ملا اور اُس نے گنوایا ہو۔ لیکن اب وہاں جانے کا سوچ کے ہی عجیب سی گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ مگر وہ چاہ کر بھی انکار نہیں کر سکتی تھی، اُسے پتہ تھا یہ اُس کے گھر والوں

کی ایک اور کوشش ہے اُسے واپس زندگی کی طرف لانے کی۔

وہ کسی کو بھی اس کوشش سے نہیں روک سکتی تھی۔ آخر پانچ سال کا عرصہ بہت لمبا عرصہ تھا۔ وہ سب تھک چکے تھے مگر ہمت ہارنے کو تیار نہیں تھے۔ ایک کے بعد ایک کوشش کرتے رہے۔ خیر ادیوا نے اپنے کچھ سوٹ نکالے اور مردہ سے دل سے پیکنگ کرنے لگی۔ اتنے میں حادی کا فون آیا۔ حادی ادیوا کا بھائی تھا، جو اشعر سے چھوٹا تھا۔

"کیسی ہو میری سویٹو سی بہنا! تمہیں کیسا لگا پاپا کا سرپرائز؟ جلدی سے ریڈی ہو جاؤ۔ میں نے ایک ہفتے پہلے ہی چھٹیاں اپلائے کر دی تھیں، آج ہی منظور ہوئی ہیں۔ بس میں 3 بجے تک گھر پہنچ جاؤں گا اور پھر......"

اتنے میں اُسے احساس ہوا، ادیوا بہت خاموش تھی۔ وہ بولتے بولتے رُکا اور بات اُدھوری چھوڑ کے پھر سے ادیوا سے مخاطب ہوا۔

"ادیوا! تم خوش تو ہو ناں؟"

"حادی! میں بالکل ٹھیک ہوں میرے بھائی! درحقیقت بہت خوش ہوں کہ ہمیں ماما پاپا کے ساتھ اتنے عرصے بعد وقت گزارنے کا موقع ملے گا۔"

ادیوا نے حادی کا مان رکھتے ہوئے بہت خوبصورتی سے اپنے جذبات چھپا لیے۔

حاوی اُس کا یہ جواب سن کر مطمئن ہوا اور فون رکھتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر شام کو ملتے ہیں۔"

"کتنا مشکل ہوتا ہے ناں! اپنوں کا مان رکھنا، مردہ دل سے جیتے رہنا، اپنا آپ ان کی خوشیوں کے لیے مار دینا۔"

وہ دل ہی دل میں سوچتی رہی۔

دوپہر کے کھانے پر سب موجود تھے۔ بس اشعر کا انتظار ہو رہا تھا، اتنے میں ڈور بیل ہوئی اور اشعر داخل ہوا۔ کچھ تھکا اور افسردہ سا لگا۔

"اشعر بیٹے! تم ٹھیک تو ہو۔"

سب کے چہروں پہ ایک پریشان کن تجسس تھا۔

"جی پاپا! وہ کل ہمارا Deligation آرہا ہے امریکہ سے اور مجھے Presentation تیار کرنی ہے، مجھے لگتا ہے میں آپ لوگوں کے ساتھ نہیں جاسکوں گا لیکن یہاں کام ختم ہوتے ہی ممکن ہے کہ میں آجاؤں گا، میں اس میٹنگ میں ہر حال میں شرکت کرنا چاہتا ہوں، مس نہیں کرسکتا۔"

"مگر بھائی! ہم آپ کے بغیر جا کے کیا کریں گے۔"

وہ تو پہلے ہی چاہتی تھی کسی طرح یہ پلان بس کینسل ہو جائے۔

اشعر نے ادیوا کی فوراً تردید کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، نہیں ادیوا! تم لوگ جاؤ۔ میں جلد سے جلد آنے کی کوشش

کروں گا اور ابھی حادی کی بھی چھٹی منظور ہوگئی ہے، اس لیے یہ موقع ضائع نہیں ہونا چاہیے۔"

پھر اس کے بعد اس ٹاپک پر مزید بات نہیں ہوئی۔ سب نے کھانا کھایا اور اتنے میں ڈرائیور نے گاڑی میں سامان رکھا۔

"فرح بیگم! آپ کا کیا خیال ہے اودیوا خوش تو ہے نا ہمارے اس اچانک پلان سے۔" عمر صاحب نے قدرے محتاط انداز میں بیوی سے پوچھا۔

"مجھے تو اس لڑکی کی کچھ سمجھ نہیں آتی عمر! یہ کیا کرنا چاہتی ہے اپنے ساتھ، میں ماں ہوتے ہوئے بھی سمجھ نہیں پا رہی، سچ پوچھیں تو مجھے تو اب اس کے چہرے پہ خوشی اور دکھ کے رنگوں میں کوئی فرق ہی محسوس نہیں ہوتا۔ میں تو اپنے رب کے آگے اس کے حق میں دعائیں کر کر کے تھک چکی ہوں۔"

"وہی ہے جو کوئی معجزہ کردے۔"

اتنے میں حادی اور اودیوا کو سیڑھیوں سے اُترتا دیکھ کے مسز عمر نے کسی اور موضوع پہ بات شروع کردی اور کچھ ہی دیر بعد سب مری کے سفر پر روانہ ہوگئے۔

گاڑی کے اندر حادی نے بہت پُرجوش ماحول بنا رکھا تھا۔ تمام نئے گانوں کی سی ڈیز ایک کے بعد ایک پلے ہورہی تھی۔ سب اپنے ہی قصے

کہانیوں میں مصروف تھے اور ادیبا مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ہر منظر کتنی تیزی سے گزر رہا تھا، پر وہ شاید کسی اور منظر کے پس منظر میں تھی۔ وہ گہری سوچوں میں گم پانچ سال پہلے کی زندگی میں پہنچ چکی تھی۔ وہ اُس احساس کو اتنی شدت سے محسوس کر رہی تھی، جو اسے صفان کے ساتھ انھی راستوں میں آتے جاتے محسوس ہوا تھا۔ وہ ایک حصار ایک طلسم کی گرفت میں آتی چلی گئی۔ پھر سے وہی سب یادیں تازہ ہوتی گئیں اس سے پہلے کہ وہ کسی اور دنیا میں پہنچ جاتی کسی مانوس سی آواز نے اُسے جھنجوڑ دیا۔

"ادیبا! کہاں گم ہو بھئی، حادی کتنی دیر سے بُلا رہا ہے۔ ایک تم ہو کہ باہر دیکھنے سے فرصت نہیں۔ یہ دیکھو! تمھارے فیورٹ موتیے کے گجرے......"

"ماما جانی! وہ میں...... میں......"

ادیبا یوں بوکھلائی، گویا پانچ سال کی مسافت دو لمحوں میں طے کر کے پہنچی ہو۔

"یہ پھول پسند نہیں اب مجھے ماما جانی! ان سے الرجی محسوس ہوتی ہے۔"

اُس کا دل پھولوں کو دیکھتے ہی ایک خیال نے مَسل کے رکھ دیا۔

اُس کا جی چاہا کہ پھول نوچ کر باہر پھینک دے۔

کچھ چیزیں جتنی ہی پسند کیوں نہ ہوں جب کسی دُکھ دینے والے سے منسوب ہو جاتی ہیں، تو پھر سکون نہیں دیتی بلکہ کلیجہ چیر دیتی ہیں۔

وہ گجرے غالباً روڈ پہ کھڑا بچہ بیچ رہا تھا ادیوا اُسے بہت اُلجھے سے انداز میں دیکھتی رہی اُس کی شکل اُس بچے سے بالکل مختلف تھی جس سے صفان نے گجرے لیے تھے۔ وہ ایک دم سے جھنجلائی جیسے کوئی بہت ممنوعہ سوچ اُس کے ذہن میں در آئی ہو۔ وہ ان باتوں پہ ایسے پریشان ہوتی جیسے اب زندگی میں اور بھی کوئی طوفان آنے باقی تھے۔ وہ کبھی بھی ایسی نہ تھی جیسا اب حالات نے اُسے بنا دیا تھا۔

پنڈی سے مری کا راستہ تقریباً 2 گھنٹے میں طے ہو گیا، ریسٹ ہاؤس پہنچتے پہنچتے شام کے 7 بج چکے تھے سب فریش ہوئے اور ڈائننگ ہال میں بیٹھ کے کھانا کھانے کے بعد حادی نے مال روڈ پر واک کرنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا سب کھانے سے فارغ ہو کر مال روڈ کی طرف روانہ ہوئے۔

موسم بہت ہی خوشگوار تھا۔ ہوا میں ایک عجیب سے پُر اسراریت تھی یا شاید اکتوبر کی ہوائیں کچھ مخصوص ہی ہوتی ہیں۔

واک کرتے ہوئے اچانک حادی کو یونیورسٹی کے کچھ دوست مل گئے اور وہ سب سے معذرت کر کے دوستوں سے گپ شپ میں مصروف ہو گیا۔

مسز عمر نے حادی کے جاتے ہی ادیوا کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اُسے

اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھائے رکھا تا کہ اس کا دھیان کسی اور طرف نہ جائے۔

"اوریوا! تمھیں پتہ ہے، شجاع بھیا کا فون آیا تھا، وہ لوگ جمعرات کو پاکستان پہنچ رہے ہیں اور عنائیہ بھی ساتھ آ رہی ہے۔ اسے سمسٹر بریک ہے، تو تمھارے ماموں نے سوچا کہ بچوں کو پاکستان کا وزٹ کروا دیں۔"

اوریوا چپ چاپ سنتی رہی۔

عنائیہ، اوریوا سے دو سال بڑی تھی مگر دونوں میں کافی اچھی دوستی تھی۔ اوریوا کو کبھی بھی بہن کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی، مگر کچھ سالوں سے وہ سب سے کٹ کے رہ گئی تھی۔ شجاع ماموں پچھلے 35 سال سے کینیڈا میں ہی رہائش پذیر تھے۔ عنائیہ دو بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ ذریاب شجاع عنائیہ سے دو سال چھوٹا اور اوریوا کا ہم عمر تھا۔ لیکن پڑھائی اور کیریئر پہ کبھی سمجھوتا نہ کرتا۔ اس لیے پاکستان بہت کم چکر لگتا۔ وہ آخری بار 8 سال پہلے پاکستان آیا تھا۔ ممانی نے بچوں کی پرورش بہت اچھی کی تھی۔ مڈل کلاس فیملی سے ہونے کے باوجود بچوں کو ایسا براٹ اپ کیا کہ شاذونادر ہی ان کی شخصیت میں کوئی نقص نظر آتا۔ تعلیم کے لحاظ سے بھی اور اخلاقی اقدار کے لحاظ سے بھی ان کے سب بچے اپنی مثال آپ تھے۔

کچھ دیر تک ان لوگوں نے حاوی کا انتظار کیا اور پھر واپس ریسٹ

ہاؤس آ گئے۔حادی نے بعد میں اپنے دیر سے آنے کی اطلاع فون پر دے دی تھی۔

اویوا کے کمرے کی بالکونی سے ویو بہت خوبصورت تھا مگر رات کے اندھیرے کی وجہ سے کچھ بھی اتنا واضح نہیں تھا۔دور مال روڈ کی سٹریٹ لائٹس بہت دھندلی سی دکھائی دے رہی تھی۔ سامنے لان میں ایک مدہم سی لائٹ روشن تھی۔اویوا کافی کا کپ لیے وہیں بالکونی میں آ کر بیٹھ گئی۔اُس کی بلیک کافی کی عادت بہت پختہ ہو چکی تھی، دن کے 6،5 کپ تو کچھ بھی نہیں تھے اس کے لیے۔وہ کڑوی بلیک کافی سے جانے کتنی تلخیوں کا زہر مارتی تھی۔یا شاید کچھ نشے ضروری ہو جاتے ہیں جب انسان تنہا اور سفر کی تھکان زیادہ ہو۔

☆☆☆

صفان سے پہلی ملاقات ......اُس کی وہ آخری سوچ ہوتی جو وہ اکثر دن کے اختتام پر سوچتی۔کبھی کبھی انسان خود کو تکلیف دینے کا اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ ذرا بھی تاخیر ہو جائے اذیت میں،تو جسم سے جیسے روح کھنچنے لگتی ہے۔

وہ دسمبر کی شام آج بھی اسی طرح ذہن میں تازہ تھی جب یونیورسٹی سے گھر آتے ہوئے اسے کسی ضروری کام سے بینک جانا پڑا۔

درمیانی لمبائی والے کھلے بال اور Fringes cut میں وہ اور بھی معصوم لگتی۔اُسے دیکھ کر بالکل ویسے ہی پیار آتا جیسے کسی بچے کی معصومیت

پر آتا ہو۔ انتہائی نازک، دُبلی پتلی سی، سیاہ قمیض کے ساتھ بلیو جینز اور پاؤں میں Sneekers بالکل ہلکی سی پنک لپ سٹک کے ساتھ وہ اتنی پرکشش لگ رہی تھی کہ ممکن ہی نہ ہوتا کہ کوئی دیکھے اور نگاہ پھیر لے۔ سیاہ جالی کا ڈوپٹہ سنبھالتے ہوئے بے دھیانی میں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی وہ بینک میں داخل ہوئی۔ چونکہ اسی بنک میں عمر حیات کے فیکٹری اکاونٹس تھے، لہٰذا برانچ منیجر اویا کو بہت اچھے طریقے سے جانتا تھا۔

اویا بے دھیانی میں والٹ کھولتی ہوئی کیش کاونٹر کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک زوردار ٹکراؤ محسوس ہوا، سامنے ایک دُبلا پتلا لمبے قد کا نوجوان جو اویا کی طرف رُخ پھیرے کسی سے فون پر بات کرنے میں مشغول تھا۔ جیسے ہی بے دھیانی میں وہ اُس سے ٹکرائی اُس نے فوراً پیچھے پلٹ کے اویا کو دیکھا، جو Sorry کہہ کر زمین سے اپنے والٹ سے گری کچھ Invoices اُٹھانے میں مصروف تھی۔

صفان علی نے جُھک کر اُس کی مدد کرنا چاہی، تو اتنے میں وہ اٹھ کر والٹ بند کرنے لگی اور کاونٹر کی طرف چلی گئی۔ ایک نظر اُٹھا کے بھی اُس نے صفان علی کو نہیں دیکھا، مگر وہ اُسے مسلسل دیکھتا رہا کہ اچانک اس کی نظر زمین پر گرے آئی ڈی کارڈ (ID) پر پڑی۔ اُس نے فوراً اٹھایا اور کاونٹر پر کھڑی اویا کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا جو کہ Cashier سے بات

کرنے میں مصروف تھی اور پھر اپنا کام ختم کر کے جیسے ہی وہ پیچھے مڑی۔ صفان علی اُس کی نظروں کا منتظر کھڑا تھا کہ اُٹھیں اور اُس کے چہرے پہ ٹھہر جائیں، چاہے وہ ٹھہراؤ ایک لمحے کا ہی ہو۔

"Excuse me !"

اویا ایک دم سے رُکی اور سامنے کھڑے نوجوان کی طرف متوجہ ہوئی۔ ایک عجیب سی کشش تھی اس کی شخصیت میں، گہری کالی آنکھیں اور چہرہ سورج سے پھوٹتی کرنوں کی طرح روشن تھا۔ بلیک ڈریس پینٹ اور وائٹ شرٹ کے اوپر بلیک بلیزر۔ کسی بزنس امپائر کے مالک کی طرح اُس کے سامنے کھڑا تھا، جو کہ بہت سلجھے اور عاجز انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔

"آئی تھینک...... یہ ID Card آپ کا ہے، غالباً؟"

اویا اُس کی آنکھوں کے حصار سے نکلتے ہوئے ایک دم چونکی۔ وہ جیسے کسی گہرے شاک سے نکلی ہو۔ وہ اپنی زندگی میں کبھی بھی اتنا کنفیوز نہیں ہوئی، جتنا اس وقت ہو رہی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اُس کے ہاتھ سے ID Card لیا اور بہت دھیمے انداز میں تھینک یو بول کے نظریں جھکا دیں۔ اویا کو لگا کہ اگر ایک بھی پل وہ اُس کی آنکھوں میں اور دیکھے گی، تو وہ ان آنکھوں کی غلام ہو جائے گی۔

اُس کے لیے صفان علی کا چہرہ کوئی عام چہرہ نہیں تھا۔ اُسے اچھی

طرح یاد تھا، وہ آنکھیں کسی سے ملتی تھیں، وہ چہرہ وہ خدوخال ہو بہو ویسے تھے جیسے اُس نے ہمیشہ سے آئیڈیلائز کیے تھے۔ وہ کبھی بھی ہر لڑکی کی طرح کسی شہزادے کا خواب نہیں دیکھتی تھی، مگر جب بھی وہ اس بارے میں سوچنے لگتی کچھ ایسے ہی نقوش اسے بنتے دکھائی دیتے۔ وہ اسی لیے تو چونک گئی تھی اسے دیکھ کے کہ جیسے خیالوں سے نکل کے ایک دم وہ اُس کے سامنے آ کھڑا ہو۔

بنک سے گھر تک آتے ہوئے وہ اُسی کی نظروں کے طلسم میں گرفتار رہی، سارا وقت بے یقینی میں یہی سوچتی رہی کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ بالکل وہی انسان وہی آنکھیں، وہی چمکتا چہرہ، ویسے ہی خدوخال یہ سب کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

☆☆☆

اودیوا انہی لمحوں کی گہرائی میں تھی کہ اچانک گیٹ پر گاڑی کے ہارن نے اُسے چونکا دیا۔ چونکہ وہ بالکونی پر تھی اس لیے فوراً متوجہ ہوئی۔ حادی اب ریسٹ ہاؤس کے اندر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اودیوا نے فوراً کمرے کا رُخ کیا کیوں کہ وہ حادی کو یہ تاثر ہرگز دینا نہیں چاہتی تھی کہ وہ رات کے اس پہر تک جاگ رہی ہے اور وہ بھی اس طرح سے بالکونی میں اکیلے بیٹھ کر۔

اب وہ بیڈ پر آ کر لیٹ چکی تھی، مگر ذہن تھا کہ ماضی میں اُلجھتا چلا گیا۔

☆☆☆

اُسے صفان علی سے وہ ملاقات یاد آئی ، جب وہ اپنی یونیورسٹی فرینڈ ماہا کے ساتھ Outlet Mall گئی۔ وہ دونوں یونیورسٹی کے سپرنگ فیسٹیول کے لیے کچھ ڈریسز لینے آئی تھی۔ ماہا چوں کہ ادیوا کی بہت پرانی اور کلوز فرینڈ تھی، اس لیے ادیوا پہلے ہی اُسے صفان علی کے بارے میں بتا چکی تھی۔ وہ ایک لمحے کی ملاقات اُس کے لیے کسی خواب کی طرح تھی۔ ماہا سے باتیں کرتے کرتے اُسے یاد آیا کہ اُسے حادی کی برتھ ڈے کے لیے کوئی اچھا سا تحفہ بھی لینا تھا۔ چنانچہ دونوں نے ایک مشہور برانڈ کی Outlet کا رُخ کیا۔ باہر ڈسپلے گلاس سے اُسے وہی مانوس سا چہرہ پھر دکھائی دیا۔ وہ کوئی اور نہیں صفان علی تھا جو کہ اُس آؤٹ لٹ کا منیجر تھا اور اس روز وہ بینک بھی اپنی Outlet کے ہی کچھ چیک ڈیپازٹ کروانے آیا تھا ، بلیک ڈریس پینٹ کے ساتھ بلیک شرٹ اور Blue Blazer ، وہ کسی شہزادے سے کم نہیں تھا۔ ادیوا کا دل ایک دم سے اتنا تیز دھڑکا جیسے بس آخری بار دھڑک رہا ہو۔ اُس نے ماہا کا ہاتھ زور سے پکڑا ، چاہا کہ کچھ بولے مگر الفاظ تھے کہ زبان سے ادا ہی نہ ہو پائے۔ ہاتھ کے اشارے سے اُس نے ماہا کو ڈسپلے گلاس سے پرے کھڑے شخص کی طرف متوجہ کروایا۔

"ماہا! یہ وہی ہے۔"

ماہا جو اُس کی حالت سے پہلے ہی تشویش میں تھی، چونک کر ڈسپلے گلاس سے جھانکا، تو وہی شخص اپنے ورکرز کو کچھ ہدایات دیتا نظر آیا۔

"ادیوا! He is so handsome"۔

ماہا کے منہ سے یہ الفاظ بے اختیار نکلے اور اتنے میں ادیوا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور واپس مڑتی ہوئی لے جانے لگی۔

"چلو یہاں سے۔" ماہا نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن کیوں ادیوا!"

"بس ماہا! میں اُس انسان کی نظروں سے ہار جاتی ہوں، میں ادیوا عمر، جو زندگی میں کبھی کسی کے سامنے کنفیوز نہیں ہوئی۔ مگر جب وہ سامنے آتا ہے، تو مجھے لگتا ہے میرا وجود پانی کی طرح بہہ جائے گا۔ میں ایک لمحہ بھی اُس کی آنکھوں میں دیکھوں گی تو وہ میری روح پہ قابض ہو جائے گا۔ بس تم چلو یہاں سے۔"

ابھی وہ اسی بحث میں تھیں کہ صفان علی سامنے آ کھڑا ہوا۔

"ارے ادیوا! آپ؟"

ادیوا جیسے پتھر ہوگئی، اُس کے منہ سے اپنا نام سنتے ہی اُسے یوں لگا کسی خواب نے سچ مچ آنکھیں کھول لی ہوں اور تعبیر بن کے اُس کے سامنے آ کھڑا ہو۔

"آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" ہوش سنبھالتے ہی اُس نے پہلا سوال یہ کیا۔

"اوہ، سوری ...... وہ اُس دن آپ کے ID Card سے پڑھا تھا۔ بائے دا وے! میرا نام صفان ہے صفان علی۔ میں یہاں کا آوٹ لٹ منیجر ہوں۔"

"آپ کو کچھ چاہیے تھا۔ آیئے اندر۔"

"نہیں ...... وہ Actually ...... پھر کبھی۔" اَدیوا بوکھلائی سی بولی۔

"ارے! ایک کپ کافی تو پی جا سکتی ہے نا۔" صفان علی قدرے محتاط انداز میں مخاطب ہوا۔ "یہ ساتھ میں ہی ایک بہت اچھا کافی chain ہے اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو؟"

ماہا نے اَدیوا کو آنکھیں دکھائیں اور ساتھ ہی بولی۔

"جی کیوں نہیں ...... چلو اَدیوا! بہت مَن ہو رہا ہے کافی کا۔"

اَدیوا ماہا کی اس حرکت سے قدرے حیران ہوئی۔

کافی پیتے ہوئے مسلسل صفان کی آنکھیں اَدیوا پر جمی رہیں۔ وہ ماہا سے بات کرتا اور نظریں اَدیوا کی طرف رکھتا۔ اَدیوا چاہ کر بھی کھل کے بات نہ کر سکی، کبھی کپ پر نظریں جما لیتی، تو کبھی ماہا کی طرف متوجہ ہوتی۔ وہ بہت ڈیپلی فیل کر سکتی تھی کہ صفان علی کا دیکھنا کسی خطرے سے خالی نہیں تھا وہ اس

کی روح پر قابض ہونا چاہتا تھا، فارمل گفتگو کے بعد وہ ادیوا سے مخاطب ہوا۔

"آپ اتنی چپ چپ نارمل لائف میں بھی رہتی ہیں یا یہ اعزاز آپ صرف مجھے بخش رہی ہیں۔"

اور ماہا بے اختیار ہنسی۔

"جی بس ایسے ہی رہتی ہوں۔"

دل تو چاہ رہا تھا کہ اُس سے ڈھیروں باتیں کرے اور سب سے پہلے اُس کے یوں دیکھنے کی وجہ پوچھے۔

لیکن مشرقی لڑکیاں شاید ایسی ہی ہوتی ہیں۔ چاہے جتنے بڑے گھر میں براٹ اپ ہوں ویلیوز تو نہیں بدلتیں۔ یہ چیزیں تو خون میں شامل ہوتی ہیں اور ادیوا چاہ کے بھی کچھ نہ پوچھ سکی۔

اُٹھتے اُٹھتے اس نے ماہا اور ادیوا کو اپنا وزٹنگ کارڈ دیا اور کہا۔

"Please کبھی بھی کچھ بھی ہیلپ چاہیے ہو، تو مجھ سے رابطہ کیجیے گا، مجھے خوشی ہوگی۔"

اور پھر وہ لوگ وہاں سے نکل آئے۔

ڈرائیور گاڑی میں انتظار کر رہا تھا، اُنھیں آتا دیکھ کر نکل کر دروازہ کھولا اور ادیوا کو مسز عمر کی کال کا بتایا۔

"بی بی فون کر رہی تھیں...... آپ کا نمبر بند تھا، تو انھوں نے مجھے

کال کی۔"

اویا نے موبائل دیکھا، تو نیٹ ورک ڈاؤن تھا۔خیر وہ ابھی آدھے راستے پہنچے کہ اویا کو اپنا نوٹس فولڈر دکھائی نہ دیا اور ایک دم ملاہا پہ چلا کر بولی۔

"اوہ نو ماہا! میرا فولڈر وہ کافی شاپ پر......"

"واٹ! اتنی غیر ذمہ داری......اویا! وہ بھی اتنی اہم چیز کے لیے۔ اب تو پہنچنے میں ٹائم لگے گا اور اگر وہ Misplace ہو گیا تو؟ تمھیں پتہ ہے تمھاری Cost accounting کے سارے نوٹس اسی میں ہیں۔خیر اب تم ایک کام کرو، وہ مسٹر آئیڈیل کو فون کرو تا کہ تمھارا فولڈر سیو ہینڈز میں ہو۔"

اویا نے جلدی سے اسی مینشن میں کارڈ نکالا اور اُس پر درج موبائل نمبر ملایا۔

"ہیلو......السلام علیکم صفان علی ہیئر۔"

اویا ایک دم سے گھبرا کر بولی۔

"جی! وہ میرے نوٹس......"

ابھی اس نے اپنی بات مکمل نہ کی تھی کہ صفان علی کے ہنسنے کی آواز آئی۔

"ارے! آپ تو بہت غیر ذمہ دار ہیں۔اتنی اہم چیز آپ بھول گئی۔

By the way آپ کے جانے کے بعد میری نظر پڑی تھی فولڈر پر اور میں اٹھا لایا تھا۔"

ادیبا کو اپنی ہتھک محسوس ہوئی ۔ وہ چپ سی رہ گئی۔ کچھ بھی تھا وہ صفان سے اتنا بے تکلف نہیں تھی کہ وہ اتنی بڑی بات کہہ جاتا۔ خیر ڈرائیور گاڑی واپس لے گیا اور اس کی Outlet سے ماہا فولڈر لے کر آئی۔ ادیبا خاموش گاڑی میں بیٹھی رہی۔ بہت زیادہ حساس ہونا اور پھر وہ بھی ایسے معاملوں میں بہت زیادہ تکلیف دیتا ہے۔

شام کو وہ سو کر اٹھی، تو موبائل پر صفان کا میسج دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"میں شرمندہ ہوں، مجھے لگتا ہے آپ نے میری کسی بات کو مائنڈ کیا۔ اگر ایسا ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔"

ریگارڈز، صفان علی!

ادیبا جانے کتنی بار وہ میسج پڑھ چکی تھی اور پھر ہمت کر کے اُسے ریپلائے کیا۔

"جی نہیں صفان علی! مجھے کچھ بُرا نہیں لگا اور میں غیر ذمہ دار ہرگز نہیں ہوں۔"

ادیبا کے اس میسج سے وہ بات واضح طور پر ظاہر تھی، جو اُسے ناگوار گزری۔ کچھ دیر تک اسی طرح سے میسجز کے تبادلے ہوتے رہے۔ یہاں تک

کہ ادیوا اصفان کے لیے اپنا دل صاف کر چکی تھی۔

☆☆☆

"یہ ماضی بھی کتنا بے رحم ہوتا ہے ناں! یاد آتا ہے، تو یہ بھی نہیں سوچتا کہ یاد کرنے والوں کی تکلیف کی شدت کتنی ہے؟ جن رشتوں کا انجام اچھا نہ ہو، تو ان کی اچھی یادیں بھی ڈھیروں ڈھیر رُلا جاتی ہیں۔"

یہ سب سوچتے سوچتے ادیوا آدھی سے زیادہ رات آنکھوں میں کاٹ چکی تھی۔ آنکھیں بھیگائے اب اسے سونے کی کوشش کرنا تھی۔ مگر ساتھ وہ ان خوابوں سے بھی خوفزدہ تھی، جو مسلسل اذیت بن کے اس کے تخیل پہ چھا جاتے تھے۔ اسے اپنی ماما کی بات یاد آئی۔

"جلدی سونے کی کوشش کیا کرو ادیوا! خواب دیکھنے ضروری ہوتے ہیں تاکہ انسان میں نئی نئی امنگیں جاگتی رہیں۔"

لیکن وہ نہیں جانتی تھیں شاید، جن آنکھوں میں پرانے خوابوں کی کرچیاں چبھتی ہوں ناں! ان آنکھوں میں نئی امنگوں والے خواب نہیں ابھرتے۔ وہ آنکھیں سو بھی جائیں، تو بھی خواب ٹوٹی امنگوں کے ہی دیکھتی ہیں۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد سب Hicking کے لیے ریڈی ہوئے۔

"حادی بیٹا! اتنا لیٹ آئے آپ رات کو۔" عمر حیات نے قدرے

تشویش کا اظہار کرتے ہوئے حادی سے پوچھا۔

"پاپا! وہ بس یونیورسٹی کے فرینڈز تھے، تو ہم لوگ لیٹ نائٹ باربی کیو کرتے رہے۔"

"اوہ! اچھا چلو کوئی بات نہیں۔"

اب وہ لوگ نتھیا گلی کی طرف روانہ ہوئے۔ ادیوا کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں ان سب راستوں سے، مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اب یادیں تکلیف دیتی ہوں، تو سہنی تو ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد وہ نتھیا گلی پہنچ چکے تھے۔ یہاں کی خوبصورتی کی الگ ہی بات تھی۔ پہاڑوں پر گھر ادیوا کو کسی محل سے کم نہ لگتے تھے، کہیں چھوٹے چھوٹے کچے گھر زندگی کی بہت بنیادی ضرورتوں سے بھی خالی ہوں شاید، مگر ان کی خوبصورتی اور ان گھروں کا سکون کسی بادشاہ کے محل سے بھی زیادہ تھا۔ اس کی بڑی خواہشوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اُس کا گھر پہاڑوں کے دامن میں ہو، جہاں سے وہ بالکونی پہ آئے، تو سامنے جھیلیں ہوں، جھرنے ہوں، اسے ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ وہ ایسی ہی جنت میں رہے۔ اس انسان کے ساتھ جو اس کا ہم سفر ہو۔

"اچھا تو میری بہنا! پہاڑ والے گھروں میں کھوئی ہوئی ہے ...... دیکھو! مجھے پتہ چل گیا۔"

حادی ادیوا سے بہت پیار تو کرتا ہی تھا، مگر اسے سمجھتا بھی تھا، کیوں کہ ادیوا اُس سے ہر بات شیئر کرتی، سکول، کالج، یونیورسٹی لیول تک آکر بھی وہ حادی کو ایسے ہی ٹریٹ کرتی، جیسے کوئی بچپن کی سہیلی۔ جو ہر بات سے واقف ہو۔ مگر کہتے ہیں نا کہ رشتے کبھی ایک سے نہیں رہتے کیوں کہ انسان بدلتا رہتا ہے۔ ادیوا بھی بدل گئی تھی حادی کے لیے۔ بچپن کی سہیلی سے صفان کے دکھ شیئر نہیں کرتی تھی۔ اب وہ بھی کیا کرتی انسان حالات کا ستایا ہو، تو بدلاؤ نا چاہتے ہوئے بھی آجاتا ہے۔

واک کرتے کرتے حادی اور ادیوا ایک قبرستان کے آگے سے گزرے تو ادیوا مسلسل قبروں کو دیکھتی رہی، کبھی کتبے پڑھنے کی کوشش کرتی اور کبھی بغیر کتبے والی قبروں پہ نظر ڈالتی۔ پھر اچانک حادی سے مخاطب ہوئی۔

"حادی! وہ اپنے سٹور روم میں جو کتبہ ہے، وہ دادی امی کی قبر کا ہے نا؟"

"ہاں ادیوا! بس اُس پر نام میں کچھ غلطی آگئی تھی، جو پاپا نے گھر آکر دیکھی۔ مجھے کہہ چکے ہیں ایک دو بار۔ مگر میرا ٹائم ہی نہیں لگا کہ جاؤں اور تبدیل کراؤں۔"

"حادی! ایک بات پوچھوں؟"

"وائے ناٹ...... ادیوا! پوچھو۔"

"کیا قبروں پہ کتبے لگانے ضروری ہوتے ہیں؟ جن لوگوں کی پہچان ہمیں ان کی زندگی میں نہیں ہوتی، تو مرنے کے بعد اُن کی قبروں کو نشانیاں دینے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ ہم نے اُن کی قبروں کو ڈھونڈ کے کون سی ایسی خوشی دینا ہوتی ہے، جو ان کے ساری زندگی کے دکھوں کا مداوا کر سکے؟

تمھیں نہیں لگتا حادی! ہمیں کتبوں کو زندہ لوگوں پہ نصب کرنا چاہیے تاکہ ان کی پہچان ہم ان کے جیتے جی ہی کر سکیں۔ پھر شاید انھیں قبروں تک پہنچنے کی اتنی جلدی نہ ہو۔"

وہ جانتا تھا کہ ادیوا ابھی کسی اور رنگ میں ہے، اس لیے وہ چپ چاپ اسے سنتا رہا۔ بہت عرصے بعد اُس نے ادیوا کو اس طرح بولتے دیکھا تھا۔ اُس کی سب باتوں کے جواب میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"ادیوا! تم بہت گہری باتیں کرنے لگ گئی ہو۔ پہلے تو تم کبھی اتنی سنجیدہ نہیں ہوتی تھی۔ تمھیں نہیں لگتا ...... پہلے والی ادیوا کی ہم سب کو بہت ضرورت ہے۔"

یہ بات سنتے ہی دل کٹ کے رہ گیا اُس کا۔ دل چاہا کہ اُس کے کندھے سے لگ کے پھوٹ پھوٹ کے روئے، نکال دے سب اذیتوں کے زہر اپنے اندر سے۔ پھر سے ویسی ہی ہو جائے جیسے اُس کے پیارے اُسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی باتیں اختیار سے بہت آگے چلی جاتی ہیں۔ ہم

ہتھیار ڈال بھی دیں، تو بھی ہار ماننے کی سزائیں سہنا پڑتی ہیں۔

"حادی! ماما پاپا کہاں ہیں؟"

"ہاں! وہ نیچے پارکنگ تک گئے ہیں۔ ابو کے دوست انکل زمان کی گاڑی پارک تھی، وہاں شاید ان کی فیملی بھی ساتھ ہے۔ آپ جناب اکیلی اوپر آ گئی پہاڑوں پر گھر دیکھنے، تو میں آ گیا آپ کے ساتھ ہی۔"

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں بھی آ گئے۔ عمر حیات نے حادی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی! آپ لوگوں کے ماموں آ رہے ہیں اور سب سے بڑی حیرت کی بات ہے کہ اس بار ذریاب صاحب بھی ساتھ ہیں ...... عنائیہ اور چھوٹی ہانیا بھی چھٹیاں انجوائے کرنے آ رہی ہیں۔"

"حادی! تم کوئی پلان وغیرہ کروا دینا ان کے ساتھ مل کے ...... بھئی میں چاہتا ہوں بچے خوب انجوائے کر کے جائیں پاکستان کو۔"

ماما کے خاندان میں ماموں شجاع پاپا کے فیورٹ تھے اور دونوں میں بہت اچھی دوستی بھی تھی۔ شجاع ماموں تھے ہی بہت سویٹ۔

"ارے پاپا! یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ آپ فکر مت کریں ان شاء اللہ! ہماری طرف سے کوئی کسر نہیں رہے گی اور ماما جانی! آپ ممانی جان کا خیال رکھئے گا بس (وہ بہت اچھی خاتون ہیں) She is so sweet

lady۔"

"حادی بیٹا! فکر نہیں کرو، میں سب کا پورا پورا خیال رکھوں گی اور ادیوا کی تو عنائیہ آپی آ رہی ہیں۔"

ادیوا سے دو سال بڑی تھی عنائیہ لیکن بچپن سے ادیوا اُسے آپی ہی کہتی۔ دوستی بھی بہت تھی اور حادی کی تو عنائیہ سے کچھ زیادہ ہی بنتی تھی۔ اب وہ دوستی تھی یا کچھ اور، یہ تو وہی دونوں جانتے تھے۔

پورا دن نتھیا گلی میں گھومنے کے بعد شام کو سب تھکے ہارے ریسٹ ہاؤس واپس آ گئے۔ ادیوا کچھ زیادہ تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی لہٰذا سب سے معذرت کر کے وہ کمرے میں آ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد مسز عمر کمرے میں داخل ہوئیں بلیک کافی کا کپ لیے۔ ادیوا اسی وقت شاور کر کے باہر نکلی تھی۔

"اوہ...... ماما جانی! تھینک یو ویری مچ۔ میں ابھی آ ہی رہی تھی کافی لینے۔ یو آر دی بیسٹ مام۔"

ادیوا کا اتنا ذرا سا بدلاؤ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئیں۔ ورنہ ادیوا تو ہر Concern ہر کیئر کو تکلف سمجھنے لگ گئی تھی۔ مسز عمر نے اسے سر پر بوسہ دیا اور روز کی طرح جلدی سونے کی ہدایت کر کے چلی گئیں۔

ادیوا نے کافی کا کپ اٹھایا اور ساتھ ہی موبائل ہاتھ میں پکڑ کر وہ فوٹو گیلری کی تصویریں دیکھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے اسے بہت پرانی یونیورسٹی کی

ایک تصویر ملی جس میں اُس نے رائل بلیو شلوار قمیض پہنی تھی اور بال ویسے ہی کھلے ماتھے پہ Fringes ۔ وہ اس تصویر کو دیکھتی رہی ، یہ اس دن کی تھی جس دن وہ یونیورسٹی کے بعد صفان علی سے پہلی بار اکیلے میں ملی تھی۔ ورنہ جتنی بھی دو چار رسمی ملاقاتیں ہوئیں، وہ ماما کی موجودگی میں ہوئی تھیں۔

☆☆☆

صفان علی وہیں کافی چین میں اس کا منتظر تھا۔ وہ ڈرائیور کے لیٹ آنے کی وجہ سے پندرہ منٹ لیٹ ہو چکی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ صفان علی کے سامنے بیٹھی تھی۔ گھبرائی سی مگر اس بار وہ پہلی ملاقات والا کنفیوژن نہیں تھا، کیوں کہ اکثر وہ لوگ فون پر بھی بات کرتے تھے اور میسجز کا بھی تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔

"ادیوا عمر! آج صفان علی چاہتے ہیں کہ آپ کوئی بات کریں۔" وہ بہت شان بے نیازی سے ادیوا سے مخاطب ہوا کہ اس پہ اچانک ادیوا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

صفان علی کا sense of Humor بہت اچھا تھا وہ اکثر ادیوا کو بہت خراب موڈ میں بھی ہنسنے پر مجبور کر دیتا۔ چاہے جتنی بھی انڈر اسٹینڈنگ (Understanding) ڈیویلپ ہو گئی تھی ، مگر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے اب بھی اسی طرح ڈرتی تھی۔

"ادیوا! ایک بات پوچھوں؟"

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

"جی صفان! پوچھیں۔"

"تمہارے نزدیک اسٹیٹس اور سٹینڈرڈ کتنی حیثیت رکھتا ہے؟ آئی مین ! پیسے کی کیا ویلیو ہے تمہارے لیے؟"

اسے اس کا سوال بہت عجیب لگا، مگر جواب تو دینا تھا۔

"صفان! میرے نزدیک اسٹیٹس، سٹینڈر اور پیسہ کچھ بھی رشتوں سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ میرے لیے رشتے نبھانا اور انھیں نکھارنا دنیا کی ہر دولت سے زیادہ اہم ہے۔"

"لیکن پھر بھی میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جن Laxuries کی آپ use to ہو اگر کبھی ان کے بغیر رہنا پڑے، تو کیا آپ رہ پاؤ گی؟"

اب وہ اس کے سوال کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔

ادیوا اتنا تو جانتی تھی کہ ایک آؤٹ لٹ مینیجر کا Status کیا ہو سکتا ہے وہ قطعاً اس لیول کا نہیں، جو Status عمر حیات کا تھا۔ ادیوا کو محسوس ہو چکا تھا کہ صفان کو کیا بات ڈسٹرب کر رہی تھی۔

"صفان! میں نے کبھی خود کو مادی چیزوں کا Use to نہیں کیا۔ میری ماں نے ہمیں شروع سے ہی ایسا ٹرینڈ کیا ہے کہ ہم ہر طرح کے حالات

میں ایڈجسٹ کر سکتے ہیں۔ ہم تینوں بہت Flexible ہیں۔ حادی اور اشعر بھائی دونوں ہی اکثر گاؤں رہنے جاتے ہیں، تو کبھی پریشان نہیں ہوتے۔"

صفان علی قدرے مطمئن ہوا۔ اب وہ ادیوا کو کچھ بھی کہتے ہوئے ایٹ لیسٹ ایسا کچھ نہیں سوچے گا، کیوں کہ وہ ادیوا کو سمجھ رہا تھا بہت اچھی طرح۔

"ادیوا! تم ہمیشہ Hot chocolate ہی آڈر کرتی ہو...... لگتا ہے تمہاری کافی سے کچھ خاص نہیں بنتی۔"

"جی! آپ صحیح کہہ رہے ہیں مجھے کافی پسند نہیں۔"

ادیوا مسلسل اس کی آنکھوں کو اپنے چہرے پہ محسوس کرتی رہی۔ ایک دو بار ہمت کر کے اس نے صفان علی کی گہری کالی آنکھوں میں دیکھنا چاہا، مگر اتنی شدید کشش تھی کہ اُسے لگا، صفان علی کے سارے جذبات آنکھوں میں اتر آئے ہیں۔ وہ کچھ بات کر کے اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کرتی، مگر الفاظ تھے کہ زبان سے ادا ہو ہی نہ پاتے تھے۔ وہ خود کو کسی طلسم میں گرفتار ہوتا ہوا محسوس کرنے لگی اور اچانک سے اسے اپنے ہاتھ پہ صفان علی کا ہاتھ محسوس ہوا اس کا وجود یخ برف ہو گیا، جیسے وہ منجمد ہو گئی ہو، کوئی جنبش کوئی حرکت کرنے سے بالکل عاری۔ نظر اٹھا کے دیکھتی، تو شاید موم کی طرح پگھل جاتی۔ ابھی

جذبات کی کشمکش میں اُسے صفان علی کی آواز سنائی دی۔

"ادیوا! مجھے نہیں پتہ، میں جو تمہارے لیے محسوس کرتا ہوں، وہ تمہارے لیے کوئی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں، لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جو میں تمہارے لیے محسوس کرتا ہوں، وہ میں کسی اور کے لیے کبھی نہیں کرسکتا۔ میری اوقات، میرا Status تمہارے لائف سٹینڈرڈ سے یکسر کم درجے کا ہے، لیکن میں ایک Self made انسان ہوں، میں چیزوں کو اپنی محنت سے حاصل کرنے کا عادی ہوں۔ جیسا صفان علی تمہارے سامنے اس وقت ہے ایسا اور کسی کے سامنے نہیں ہوتا۔ میں بہت پریکٹیکل انسان ہوں، میرے نزدیک زندگی کی Realities کی زیادہ اہمیت ہے بجائے کہ خوابوں کی دنیا کے۔ یہ پیار محبت کے جذبات اپنے مخصوص ٹائم پر ہوں، تو زیادہ اچھے لگتے ہیں، میں کبھی ان چیزوں میں نہیں پڑا ادیوا! لیکن جس دن سے تم میرے سامنے سے گزری، تمہارا وہ مجھ سے ٹکرانا، بالکل ایسے ہی تھا جیسے تپتے صحرا میں بے موسم بارش کا برس جانا۔ میرے محبت کے بارے میں سارے اندازے غلط نکلے ادیوا......! یہ کبھی بھی پوچھ کر نہیں ہوتی، یہ کبھی بھی نہیں دیکھتی کہ مخصوص ٹائم کیا ہے۔ اسے کوئی غرض نہیں آپ Stable ہو میچور ہو یا نہیں ہو...... جو مخصوص ٹائم میں نے محبت کے لیے سوچ رکھا تھا کہ پہلے اپنے آپ کو Stable کروں گا Business Setup کروں گا، یہ اس

نام سے بہت پہلے ہو گئی ادیبا......!"

وہ مسلسل اس کا ہاتھ تھامے بولتا چلا گیا۔ صفان علی اس قدر Expressive تھا ادیبا کو کبھی گمان تک نہ ہوا۔ وہ اس کی سب باتوں کو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سُن رہی تھی۔

شاید محبت میں بہت طاقت ہوتی ہے اظہار پہ آجائے تو بہت ہمت آجاتی ہے انسان میں اور وہ اُس کی آنکھوں سے سچا اظہار محسوس کر سکتی تھی۔ اُس کا دل چیخ چیخ کر صفان علی کی محبت کی گواہی دے رہا تھا، وہ سب ایک خواب لگ رہا تھا۔ ادیبا کو زندگی اتنی بڑی خوشی دے گی، اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اس کا آئیڈیل اُس کے اظہار سے پہلے ہی اقرار کر چکا تھا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا تھا اُس کے لیے۔ وہ چاہ کر بھی اُسے نہ کہہ پائی۔

"میں نے تم سے محبت تب سے کی ہے جب سے جذبات کو اپنے اندر پھوٹتے دیکھا، اُن جذبات کی تخلیق سے تحلیل تک کا سارا عمل صفان علی کے پیکر کے گرد گھومتا ہے۔"

وہ چاہتی تو اس کے ہاتھوں کو اور بھی مضبوطی سے تھام لیتی اور اپنے دل کے سارے جذبات اسی کے قدموں میں بچھا دیتی، مگر وہ صفان علی کو سننا چاہتی تھی۔ وہ اس کے ایک ایک لفظ کی گرویدہ ہو چکی تھی۔ محبت کا حصار کتنا دلفریب ہوتا ہے۔ انسان خود کو دنیا میں سب سے زیادہ محفوظ تصور کرنے لگتا

ہے اور اویوا بھی محبت کے حصار میں آچکی تھی۔

صفان علی نے اویوا کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اب وہ یہ ہاتھ کبھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا......کبھی بھی نہیں۔

☆☆☆

ایک دم سے موبائل ہاتھ سے گرا اور وہ چونک گئی۔ آنسو جانے کتنی دیر سے بہہ رہے تھے۔ وہ پھر سے اُسی کرب سے گزر رہی تھی، جو قسمت نے محبت کی آخری نشانی کے طور پر اس کو سونپ دیا تھا۔ کچھ دیر بالکونی میں بیٹھنے کو دل چاہا، تو وہ باہر آ کر بیٹھ گئی اور پھر کچھ ہی دیر بعد فجر کی اذان ہونے لگی۔ وہ بہت محو ہو کر اذان سنتی رہی، اس کے دل کو عجیب سا سکون محسوس ہوا، اٹھی اور وضو کر کے نماز پڑھنے لگی۔ اویوا کو پتہ نہیں کس طرح یہ خیال آیا، مگر کچھ تھا کہ وہ ایک لمحے کو بھی کسی سوچ میں ڈوبے بغیر اللہ کے سامنے جھک گئی۔ کبھی کبھی انسان اتنا خالی ہو جاتا ہے کہ کشکول لے کے رب کے حضور جھکنے سے ہی سکون کی دولت ہاتھ آتی ہے۔ وہ جی بھر کے رونا چاہتی تھی، مگر ہر بار آنسو پی جاتی، لیکن اب جیسے ہی اُس نے رب کے آگے ہاتھ اٹھائے آنسوؤں کی جیسے قطاریں لگ گئی۔ اُس کا دل چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے اپنے اللہ کو اپنے اندر کا حال سنائے، مگر انسان کتنا بے خبر ہے ناں! اس کا رب تو پہلے سے ہی اس کے اندر آنے والے ہر سونامی سے واقف ہے۔ اویوا نے ہاتھ اٹھائے

اور اس مالک سے دعا مانگنی شروع کی، کیوں کہ آج اس کی حالت واقعی ضبط کی حدیں توڑ چکی تھی۔

"میرے مالک! تو جانتا ہے...... مجھے رول دیا ہے ایک شخص کی چاہ نے، ریزہ ریزہ کردیا ہے یہ وجود، میں اُٹھ کے دو قدم چلوں بھی، تو لڑکھڑا کے گر جاتی ہوں۔ میرے سارے حوصلے فنا ہو چکے ہیں، میرا ضبط ٹوٹ گیا ہے، میرا کرچی کرچی وجود کئی نشتوں میں بکھرا ہے۔ اب تو مجھے اپنی جائے فنا بھی یاد نہیں۔ میرے مالک! مجھے کوئی نشاں دکھا دے، مجھے صبر دے دے، اپنے سہاروں پہ خود کفیل کردے، تو جانتا ہے، تو واقف ہے میں تیرے ہاتھوں کی تخلیق ہوں تو میری ہر ہر رمز سے واقف ہے۔ تو میری تکلیف کی شدت سمجھ سکتا ہے! یا اللہ! میرے حال پہ رحم فرما! تو بہت وراء الوراء ہے تو چاہے تو مجھے سنوار دے اور چاہے تو خاک میں ملا دے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ لفظ بھی مکمل ادا نہ ہو پاتے، دل تھا کہ سینے سے باہر نکلنے کو تھا۔ ادیوا نے خود کو سنبھالنا چاہا، مگر وہ زارو قطار روتی چلی گئی۔

"بس التجا ہے میرے سوہنے رب! مجھے اپنی محبت عطا کر، میری روح کو اپنا حصار دے دے۔"

حصار کے لفظ پہ ادیوا کی روح ہی کانپ اٹھی۔ انسان کی محبت کا

حصار روح پر مسلط ہو جائے، تو اللہ کے سامنے جھکتے ہوئے روحیں کانپ ہی جاتی ہیں۔ روح پر غیر اللہ کا قبضہ ہو، تو قبضہ دینے والا بھی بھگتا ہے اور قبضہ لینے والا بھی۔۔ لیکن دل سے ادا کی گئی نماز کبھی سکون سے خالی نہیں ہوتی اور سچے مانگنے والوں کو اللہ کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔

اب اسے بہت سکون محسوس ہو رہا تھا۔ اللہ کے سامنے رونا اور دل ہلکا کرنا بالکل ایسے ہی ہوتا ہے، جیسے عدالت میں کٹہرے ہو کر جج کو اپنی صفائی میں کچھ کہنا، پھر فیصلہ چاہے آپ کے حق میں ہو یا نہ ہو...... آپ کے ضمیر پہ کوئی بوجھ نہیں رہتا۔

بہت عرصہ بعد وہ اتنے سکون سے سوئی تھی، دن کے 12 بج چکے جب وہ کمرے سے باہر گئی، تو سب لاؤنج میں بیٹھے اشعر سے باتوں میں مصروف تھے۔

"ارے بھائی! آپ آگئے؟" وہ فوراً اشعر کی طرف بڑھی۔

"جی السلام علیکم! میری چڑیا! میں گیا تھا آپ کے روم میں۔" اشعر نے پیار سے بہن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "پر آپ اتنی گہری نیند میں تھیں کہ میں نے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"بھائی! آپ کی میٹنگز کیسی رہیں؟"

"بس یہی بتا رہا تھا ابھی پاپا کو، سب الحمد اللہ بہت اچھا رہا۔ آؤ

بیٹھو۔"

مسز عمر نے فوراً اویوا کے لیے ناشتہ لگوایا اور پھر سب شجاع ماموں کی آمد کے لیے پلاننگز کرنے لگے۔

آج شام میں مال روڈ پر واقع Blue Logon میں انھیں عمر حیات کے دوست زمان نے ڈنر پہ انوائیٹ کیا تھا۔ اویوا بھی ان کے ہمراہ تھی۔ اب وہ کوشش کرتی رہی کہ جتنا خوش دکھائی دے سکے، دے۔ خیر ڈنر سے فری ہو کر سب نے مال روڈ پر کچھ دیر واک کی۔

اشعر اور حادی دونوں ہی اویوا کے ایک بائیں اور ایک دائیں چلتے رہے اور یہ وہ بچپن سے کرنے کے عادی تھے۔ اویوا خود کو کسی سلطنت کی شہزادی سمجھتی تھی۔ بھائیوں کا اتنا پیار ملے، تو بہنیں ویسے ہی خود کو دنیا سے الگ سمجھنے لگتی ہیں۔ پورے راستے وہ کبھی کسی نہ کسی طریقے سے اویوا کو ہنساتے کی کوشش کرتے رہے۔ اویوا نے بھی بھائیوں کو مایوس نہیں ہونے دیا۔ کئی موقع کئی منظر ایسے تھے کہ اسے اپنے ماضی کی تمازتیں یاد آئی اور وہ اندر ہی اندر گھٹتی رہی، مگر بھائیوں کا پیار ہی اتنا تھا کہ ان کی ان تھک کوششوں کو وہ کسی بری یاد کی نظر تو بالکل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ اگر دن میں وہ ایک قدم آگے بڑھاتی اپنے ماضی سے نکلتی، تو رات میں دس قدم واپس لوٹ آتی۔ کسی طلسم کا اثر اتنی جلدی تو پیچھا نہیں چھوڑتا اور وہ بھی محبت

کا......اور محبت بھی ایسی، جو کسی سونامی طوفان کی طرح سب کچھ بہا کر لے گئی ہو۔

ریسٹ ہاؤس واپس آ کر سب کچھ دیر لاؤنج میں بیٹھے اور پھر اپنے کمروں میں آرام کے لیے چلے گئے۔ ادیبا کمرے کی دیوار سے لگ کر بالکونی کے دروازے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہی مدھم سی روشنی، جو لان میں اکثر جلتی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہی۔

☆☆☆

وہ شام جب صفان علی اسے یونیورسٹی کے باہر منتظر ملا، اس کے بعد کافی دیر وہ اس کے ساتھ رہی۔ وہ بہت دیر تک واک کرتے رہے فٹ پاتھ کی سٹریٹ لائٹس بھی اسی طرح مدھم تھی۔

"ادیبا! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں......"

صفان علی نے ادیبا کو اسی محبت بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم میرے لیے کسی معصوم بچے کی چاند کی خواہش کی طرح ہو، جس کے بہلنے کے لیے دلاسہ کافی نہیں ہوتا۔ جب تک کہ جھوٹی آس نہ دلائی جائے۔ ادیبا! میں جانتا ہوں کہ میری اتنی اوقات نہیں، جو میں مانگنے جا رہا ہوں، لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی امی کو تمہارے گھر بھیجوں۔"

ادیبا کا دل چاہا کہ وہیں اس کے قدموں میں بیٹھ جائے اور اس

محبت پہ سے دل و جان وار دے۔۔وہ پوری کائنات سمیت کے صفان علی کے قدموں میں رکھ دے اور کہہ دے۔

"ادیبا عمر تمھارے علاوہ کسی اور کی ہو ہی نہیں سکتی، میری کائنات تم! میری ذات تم میری ہستی کچھ بھی نہیں صفان علی کے بغیر۔"

جانے کیا کچھ سوچتی چلی گئی، مگر کچھ نہ کہہ پائی۔

کبھی کبھی Expressive نہ ہونا بھی کتنی تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔آپ اپنی جان سے پیارے انسان کے آگے بھی اپنے دل کا حال کھول کر نہیں رکھ سکتے۔

اس نے ادیبا کو پھر سے مخاطب کیا، جو کہ کافی دیر سے اپنے سوال کے جواب کا منتظر تھا۔

"میں نے کچھ پوچھا تھا؟"

ادیبا نے شرما کے نظریں جھکا دی اور کہا۔

"فون پر بتا دے گی۔"

اب وہ گھر آئی، تو ماما جانی کچن میں کام کر رہی تھیں۔ادیبا نے جاتے ہی ماں کو ڈھیر سارا پیار کیا اور اسے دیکھ کے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اگر لوگ خوشی سے پاگل ہوتے، تو وہ کیسے لگتے۔

"ماما جانی! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔"

"بولو بیٹا! میری جان کیا ہوا؟ آج کیا بات ہے میری بیٹی ماشاءاللہ بہت خوش ہے۔"

"ماما جانی! وہ مجھے کسی کو ملوانا ہے آپ سے، آپ پلیز! ان سے مل لیں۔"

اویا کے چہرے پہ صاف صاف تحریر تھا کہ وہ کسی خاص انسان سے ملوانا چاہتی ہے۔

اور پھر ماں تو صورت سے ہی پہچان جاتی ہے اپنے بچوں کو کہ ان کے چہرے پہ خوشی کا کون سا رنگ ہے۔

مسز عمر انتہائی خوش تھیں۔وہ تو بس اپنی بچی کی خوشیوں کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھیں۔اویا کے چہرے کی خوشی ہی اتنی بڑی گارنٹی تھی کہ انھیں اویا سے باقی رہی باتیں پوچھنا مناسب نہ لگا۔انھیں اویا کی پسند پر بہت یقین تھا اگر اس نے کسی کو پسند کیا ہے، تو وہ کوئی عام انسان ہو ہی نہیں سکتا۔

صفان کی چھٹی چوں کہ اتوار کو ہوتی تھی، اس لیے انھیں اتوار کو کھانے پہ انوائیٹ کیا گیا، حاوی، اشعر اور عمر حیات سب دل و جان سے اویا کی خوشیوں کو ویلکم کرنے کے لیے بے تاب کھڑے تھے۔

کچھ ہی دیر میں ٹیکسی رکی اور ڈور بیل ہوئی۔صفان علی اپنی والدہ کے ہمراہ بہت تہذیب سے اندر لایا گیا۔اویا عمر کا گھر کسی Embasidor

کے بنگلے سے کم نہیں تھا۔صفان کی والدہ بار بار گھر کو دیکھتی اور پھر صفان کے چہرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھتی ، جیسے انھیں یقین ہی نہ ہو کہ اس گھر کے لوگوں میں اتنا ظرف ہو گا کہ ان کی بات کو شرف قبولیت کا درجہ دیا جائے گا۔

صفان علی ایک مڈل کلاس فیملی سے تھا، مگر عام انسان نہیں تھا۔اس دن بلیو جینز اور بلیک شرٹ میں وہ بہت ڈیسنٹ لگ رہا تھا ہمیشہ کی طرح۔

سب لوگوں نے ان کا بہت وارم ویلکم کیا۔۔صفان کی والدہ چوں کہ کم گو معلوم ہوئیں، اس لیے عمر حیات اور مسز عمر خود ہی وقتاً فوقتاً انھیں کسی نہ کسی بات میں شامل کر لیتے ،تو وہ بھی ہاں، نہیں میں جواب دیتی رہیں۔

اتنے میں ادیوا لاؤنج میں داخل ہوئی، وہ فریش ریڈ کلر شفون کا ڈیزائنرز ویئر سوٹ یوں لگتا تھا کہ جیسے بنا ہی اس کے لیے تھا، گولڈن دوپٹہ جو اس نے انتہائی خوبصورت طریقے سے سر پر لے رکھا تھا۔ ہلکے گولڈن شیڈز کا میک اپ اور ریڈ لپ اسٹک اس کے چہرے کا نور دوبالا کر رہا تھا۔وہ سب بناؤ سنگھار جو اس نے صفان علی کے لیے کیا تھا،صفان کی نظر اس پہ پڑتے ہی وہ اٹھ کے کھڑا ہو گیا جیسے اس کی تعظیم اس پر فرض ہو چکی تھی۔لاؤنج میں موجود ہر شخص کو صفان کی اس حرکت نے بہت متاثر کیا۔اب وہ سلام کر کے صفان کی والدہ کے سامنے آ کر بیٹھ چکی تھی ، جو ادیوا کے سحر میں گرفتار بیٹھی تھی۔

دل ہی دل میں وہ صفان علی کی قسمت پر ناز کر رہی تھیں۔

عمر حیات نے کچھ رسمی باتیں پوچھنے کے بعد صفان سے اس کے فیوچر پلان کا پوچھا، بالکل ویسی ہی تشویش انھیں بھی تھی، جو ماں باپ کو بچیوں کے رشتے کرتے ہوئے ہوتی ہے۔

''انکل! میں بہت بڑے بڑے خواب نہیں دیکھتا...... بس اتنا ہی سوچتا ہوں، جو حقیقت ہو سکتا ہے اور ویسے بھی خواب بڑے بڑے دیکھو، تو چھوٹی چھوٹی خوشیاں آپ محسوس نہیں کر سکتے اور میں ہر لمحے کو جینے والا انسان ہوں۔ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ محنت کرنے پر یقین رکھتا ہوں، شارٹ کٹس مجھے اچھے نہیں لگتے۔''

صفان علی اپنے بارے میں قدرے تفصیل سے بتاتا چلا گیا۔

''میں ایک خوددار انسان ہوں انکل! بھیک میں محبت بھی مل جائے تو نہیں لیتا۔ میرے اپنے کچھ رولز ہیں جنھیں میں کسی کے لیے نہیں توڑتا۔''

اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اس کی شخصیت کے پروقار ہونے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ایک بار پھر اویا عمر کو اس نے انتہائی حد تک متاثر کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس پر ناز کرنے لگی۔

عمر حیات کے گھر کا ہر فرد اس کی سوچ کا گرویدہ ہو چکا تھا اور محنت کرنے والا انسان زندگی کے ہر موڑ پر ایک کامیاب انسان ہی ہوتا ہے۔ اس

کے وقتی اسٹیٹس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے، ادیوا کی پسند غلط نہیں تھی۔

اگلے ہفتے انھیں صفان علی کے گھر جانا تھا۔ عمر حیات بیوی اور اشعر کو لے کر ان کے گھر روانہ ہوئے۔ پنڈی کے ایک تنگ بازار سے گزر کر کچھ گلیاں کراس کر کے ایک تین منزلہ گھر کے باہر صفان علی ان کا منتظر تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی صفان علی انھیں سیڑھیوں کی طرف لے گیا، کیوں کہ پہلا اور دوسرا پورشن کرائے پر تھا، مالک مکان نے تینوں سٹوریز تین فیملیز کو دے رکھی تھیں اور صفان کی فیملی سب سے اوپر والی منزل پر تھی۔ وہ لوگ اوپر پہنچے، تو سیڑھیوں کے ساتھ ایک روم تھا، جو کہ غالباً ڈرائنگ روم تھا۔

آگے دو کمرے تھے اور کچن اور باتھ روم۔ اگر دل بڑے ہوں، تو گھر چھوٹے بھی محلوں سے کم نہیں ہوتے اور جس طرح ان سب کا اخلاق تھا، وہ ہر منفی سوچ کی تردید اپنے آپ کر رہا تھا۔ صفان کے تین بہن بھائی اس سے چھوٹے تھے، مگر اس گھر کا ہر فرد ہی کام کرتا تھا۔ گھر کے خرچے پورے کرنے کے لیے سب بچوں کی تعلیم ادھوری رہ گئی تھی۔

خود صفان صرف میٹرک پاس تھا، کیوں کہ چھوٹی عمر میں اس پر بہت بڑی بڑی ذمہ داریاں آ چکی تھیں، لیکن اس کی شخصیت، اس کا رکھ رکھاؤ، کسی بزنس مین سے کم نہیں تھا۔ شاید اسلام آباد کی مشہور برانڈ آؤٹ لٹ کا منیجر

ہونے کی وجہ سے اسے ڈریسنگ کی بہت اچھی سمجھ تھی۔صفان کے والد پہلے جیولر تھے بہت اچھا سیٹ اپ تھا،مگران کو بزنس میں ایسا لاس ہوا کہ سب کچھ بک گیا، سب ختم ہو گیا اور پھر انھوں نے زیرو سے سٹارٹ لیا اور اب سب محنت کر رہے تھے تقریباً گھر کے سبھی مرد۔

ان کی ایک بیٹی تھی، جس کا نکاح ہو چکا تھا، بس رخصتی میں کچھ عرصہ تھا۔

صفان علی کے گھر سے واپسی پر اشعر نے والد سے قدرے فکرمند انداز میں سوال کیا۔

"پاپا! کیا آپ کو لگتا ہے، ہمارا فیصلہ اویا کی زندگی کے لیے بہتر ہوگا؟"

عمر حیات نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے،مگر جو چمک میں نے صفان علی کی آنکھوں میں دیکھی ہے، وہ کسی عام انسان کی آنکھوں میں نہیں ہوتی...... وہ Ambitious لڑکا ہے اور ایسے لوگ زیادہ دیر تک ایک سے حالات میں نہیں رہتے۔قسمت کھل جاتی ہے ان کی اور پھر ہم جو ہیں اپنی بیٹی کے ساتھ۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دیں گے۔"

اشعر قدرے مطمئن ہوا اور مسز عمر کے دل کو بھی گہری تسلی ہوئی۔

دو ہفتوں بعد وہ لوگ منگنی کی تاریخ لینے آئے اور سب کچھ ایک خواب کی طرح لگنے لگا۔

صفان علی اور اویدا کی محبت تکمیل کی طرف رواں تھی اور پھر منگنی سے ایک دن پہلے صفان نے اویدا کو اسی کیفے جینن میں بلایا۔

اویدا کچھ پریشان ہوئی کہ ایسی کیا بات ہے، جو صفان علی نے اسے اس طرح اچانک بلایا۔ خیر وہ چلی گئی۔ اب وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"اویدا! مجھے پتہ ہے تم ضرور سوچ رہی ہو گی کہ آخر کیا بات ہے ایسی جو میں نے تمھیں یوں بلایا۔"

اویدا وہی معصوم سے انداز میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔

صفان نے بہت محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔

"اویدا! تمھیں یاد ہے نا تم نے کہا تھا کہ تمھیں رشتے نبھانا اور نکھارنا دنیا کی مادی چیزوں کے مقابلے میں زیادہ اہم لگتا ہے۔ تم ایڈجسٹ کر سکتی ہو، کیوں کہ تمھاری شخصیت میں Flexibility ہے۔ آج جو میں تم سے مانگنے جا رہا ہوں، تمھیں مجھے دینا ہو گا اور مجھے امید ہے تم میرے مان کو، میری عزت نفس کو مجروح نہیں کرو گی۔"

اویدا کا دل ایک دم سے مٹھی میں آ گیا، وہ دل ہی دل میں دعا

کرنے لگی۔

"صفان علی! مجھ سے جدائی کے علاوہ کچھ بھی مانگ لو...... میں اپنی جان بھی وار سکتی ہوں تمھاری خوشی کے لیے۔"

"ادیوا! میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ تم میری خودداری کو، میری عزت نفس کو ایسے ہی عزیز سمجھو، جیسے تمھارے لیے میرا وجود ہے۔ میں تمھیں زیادہ نہیں الجھاؤں گا...... میں اتنا کہنا چاہتا ہوں کھلے لفظوں میں کہ میری ساری دولت، سارا اثاثہ تمھاری ذات ہے، میرے گھر میں اگر کسی چیز کی کمی ہے، تو وہ صرف تم ہو، اور تمھارے لیے وہاں محبت ہی محبت ہے جسے تم پہلے ہی ہر دنیاوی چیز پر فوقیت دے چکی ہو۔

ادیوا! میں نہیں چاہتا کہ تم دنیا کی سب وہ چیزیں اپنے ساتھ لاؤ جس کا بوجھ میں اپنی روح پر محسوس کرتا رہوں، مجھے صرف تمھارا وجود کافی ہے۔

تم اپنے گھر سے کوئی جہیز نہیں لاؤ گی، یہ تم مجھ سے وعدہ کرو۔ مانتا ہوں کہ ہر ماں باپ اپنی بچیوں کو یہ سب ان کے سکون کے لیے دیتے ہیں، مگر میں یہ سب ان سے تب قبول کروں گا، جب اتنا Stable ہو جاؤں گا کہ ان چیزوں کا بوجھ اٹھا سکوں۔ ادیوا! تم سمجھ رہی ہو نا میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

ادیوا اس کی آنکھوں سے ہوتی ہوئی کسی اور ہی دنیا میں پہنچ چکی تھی۔

اسے صفان علی قطعاً اس دنیا کا نہیں لگ رہا تھا، کتنا بلند کردار تھا صفان ...... بہادر، Strong ...... سچ کہتے ہیں، لوگ نام کا بہت اثر ہوتا ہے اور وہ تو بہادری کے سارے ریکارڈ توڑ چکا تھا۔ادیوا کے دل میں اس کا مقام اور بھی بڑھ گیا تھا۔اسے بے انتہا فخر تھا اپنے انتخاب پہ۔وہ انسان جو اس کے تخیل میں اتنا حسین تھا، حقیقت بن کے سامنے آیا، تو محبتیں لٹانے میں انتہا ہی کرتا چلا گیا۔ادیوا اس لمحے کو دعائیں دیتی، جس لمحے نے پہلی بار اس کا چہرہ تراشا تھا، وہ خیال اسے ہر سوچ سے بڑھ کر عزیز تھا۔

☆☆☆

اچانک اسے اپنے پاؤں شل ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔وہ ایک دم سے اذان کی آواز پہ چونکی، بالکونی کے سامنے دیوار سے لگ کے کھڑے اسے صبح ہو چکی تھی۔سارا وجود درد سے ٹوٹ رہا تھا اور پاؤں تو جیسے برف کی طرح منجمد ہو چکے تھے، وہ کتنی دیر سے ماضی میں ڈوبی رہی اور اسے رات گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔

وہ درد کو بہت اچھی طرح سمجھ چکی تھی، کیوں کہ وہ اس کی ایک ایک رگ کے اندر کبھی نہ ختم ہونے والی چبھن بھر چکا تھا اور اصل میں درد تو وہی ہوتا ہے، جو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹتا ہے، کھا جاتا ہے۔ہمارے وجود کو،

جنگل میں پڑی کسی لاوارث لاش کی طرح۔

"پتا نہیں کیوں لوگ ہمیں پھر بھی زندہ لوگوں میں شمار کرتے ہیں، حالاں کہ ہمارا وجود تو کب کا مٹ چکا، مٹی ہو چکا، وہ درد جو رگوں میں چبھن کی طرح محسوس ہوتا تھا اس درد نے کب کا روح کو جسم سے جدا کر دیا۔ اب تو بس اس فانی جسم کی تدفین ہونا باقی ہے، ورنہ ہم چلتی پھرتی لاشیں ہیں، احساس سے خالی۔ اب درد محسوس نہیں ہوتا، ہمارے آگے کتنا ہی بین کرو، واسطے ڈالو، ہم بے اثر ہو چکے ہیں، پتھر کے مجسموں کی طرح۔"

وہ سوچتی چلی گئی، یہاں تک کہ اسے پھر سے کسی خیال نے جھنجھوڑ دیا اور وہ نماز کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

کبھی کبھی انسان مایوس نہیں ہوتا بس تھک جاتا ہے اور اودیا اب تھک گئی تھی۔

اگلے دن جب وہ اٹھی، تو اسے اپنا پورا وجود آگ کی طرح دھکتا ہوا محسوس ہوا، اس نے اٹھنے کی کوشش کی، تو اس سے اٹھا نہ گیا۔ پورے جسم میں اتنا شدید درد تھا کہ وہ اپنا آپ ٹوٹتا ہوا محسوس کر رہی تھی، لیکن ہمت کر کے وہ کھڑی ہوئی اور دیوار کا سہارا لے کر واش روم تک گئی، تو ایک دم سے اس کی ناک سے شدید خون بہنے لگا۔ وہ واش بیسن میں گرتے خون کے قطرے دیکھ رہی تھی کہ مسز عمر اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"ادیوا! کدھر ہو بیٹا؟"

وہ جیسے ہی واش روم تک آئیں، ادیوا واش بیسن میں سر جھکائے کھڑی تھی، وہ فوراً آگے بڑھیں اور واش بیسن میں اتنا خون دیکھ کر ان کا دل ہولنے لگا۔

"ادیوا! یہ کیا کر رہی ہو بیٹا! کیوں ہماری جان لو گی؟"

وہ ساتھ ساتھ روتی رہیں، ساتھ ٹاول گیلا کر کے اس کے ناک پر رکھا، اس کو پکڑ کر بیڈ تک لانے لگی، تو ادیوا کا وجود دہکتا ہوا محسوس ہوا۔

"اوہ خدایا......! اتنا تیز بخار ہے تمہیں۔ادیوا! یہ کیا دشمنی ہے اپنے ساتھ تمہاری۔ Nose Bleeding کی وجہ تم جانتی ہو، جس مقدار سے تم بلیک کافی پی رہی ہو، یہ تمہارا اندر جلا دے گی بیٹی!" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

ادیوا دل میں کہنے لگی۔

"ماما میری کوئی دشمنی نہیں ہے اپنے آپ سے، لیکن یہ دُکھ کوئی چھوٹا دُکھ نہیں ہوتا کہ آپ اس انسان سے نفرت نہ کر سکیں، جو آپ کی زندگی تباہ کر گیا ہو۔بس یہی گلا ہے مجھے اپنے آپ سے کہ اس نے تو دغا دیا ہی، میرے اپنے حافظے نے بھی میرے ساتھ غداری کی۔وہی یادیں میرے لہو میں اُترتا رہا، جو میری روح کے سرطان کا باعث بنتی گئیں۔"

نوز بلیڈنگ تو رک چکی تھی، مگر ادیبا کو 103 بخار تھا۔ مسز عمر نے فوراً عمر حیات کو ادیبا کی حالت سے آگاہ کیا۔ اشعر، حادی، عمر حیات سب ادیبا کے کمرے کی طرف بھاگے اور اب سب اس کے آس پاس بیٹھے تھے۔ عمر حیات نے بیگم سے واپسی کا پوچھا، تو وہ سب اس کی تائید میں تھے کہ ادیبا کی حالت کی وجہ سے بہتر ہے کہ واپس چلنا ہی ٹھیک رہے گا۔ ادیبا Anti stress گولیاں کھا کے مری سے واپسی کے سفر کے دوران سوئی رہی۔ گھر پہنچتے ہی ڈاکٹر شہزاد کو ادیبا کے چیک اپ کے لیے گھر بلایا گیا۔ ڈاکٹر کچھ ہی دیر تک گھر پہنچ چکا تھا اور بخار اور Mental strees کی میڈیسن Prescribe کر کے مسز عمر اور عمر حیات کو ادیبا کے آرام کا خیال رکھنے کی تلقین کر کے چلا گیا۔ پورا گھر ادیبا کے لیے جان ہتھیلی پر لیے کھڑا تھا۔ کتنے بے بس تھے سب، کاش کوئی ایسی دوا بھی ہوتی جسے پیتے ہی روح پہ لگے گھاؤ بھر سکتے۔ کبھی کبھی ہمارے اندر چلنے والی جنگ کے اثرات بھی کسی سونامی یا ہیروشیما سے کم نہیں ہوتے۔ سال ہا سال گزر جاتے ہیں تباہی کے آثار مٹاتے مٹاتے، مگر پھر بھی وہ اثرات ہماری امیدوں، آرزوؤں کو اپاہج کر ہی جاتے ہیں۔

اب ادیبا عمر قدرے بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اٹھ کر لاؤنج میں گئی، جہاں سب پہلے سے ہی اسی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

"ارے ادیوا کیسی ہو؟" اب اشعر نے اسے آتا دیکھ کر فوراً اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"جی بھائی! اب تو بہت بہتر فیل کر رہی ہوں۔ ابھی آنکھ کھلی تھی تو سوچا کہ دیکھوں آپ سب کیا کر رہے ہیں۔"

مسز عمر فوراً سیب کاٹ کر ادیوا کے آگے رکھتے ہوئے بولیں۔

"اب شرافت سے یہ سارا ختم کرو۔ میں تمھارے لیے سوپ بنواتی ہوں۔ آج سے تمھاری کافی بند ہے ادیوا!"

وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بے بس سی انھیں دیکھتی رہی۔ حادی نے فوراً ادیوا کو کچھ نیو ایکشن مووِیز کے ریلز ہونے کا بتایا اور کوشش کرنے لگا کہ اس کو کنوینس کرے، تو سب لوگ سینما چلیں، وہاں یہ سب اکثر جاتے تھے، مگر پچھلے کچھ سالوں سے گھر کا سارا سسٹم ہی بدل گیا تھا۔

ادیوا نے شجاع ماموں کی فیملی کے آنے پر سینما جانے کا پر دس کیا، تو حادی کو کچھ تسلی ہوئی۔ اب وہ سب مل کر ٹی وی سیریل دیکھنے لگے، جو وہ اکثر دیکھا کرتے تھے، آج اس کی شاید آخری قسط تھی۔ ڈرامے کے اختتام پر ہیرو اور ہیروئن کی شادی کا سین تھا اور وہ دیکھتے ہوئے ادیوا بہت uncomfortable محسوس کر رہی تھی خود کو۔ مسز عمر کا دھیان اسی کی طرف تھا اور وہ اس کی کیفیت کو محسوس کر رہی تھیں۔ ادیوا نے سر درد کا بہانہ کیا

اور سونے کے لیے کمرے میں آ گئی۔اس کے لیے یہ سب کچھ دیکھنا اور نارمل رہنا بہت ہی مشکل کام تھا۔شاید دنیا کا سب سے زیادہ مشکل کام۔

تھوڑی دیر کے بعد مسز عمر سوپ لے کر اس کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

"ادیوا بیٹا! یہ پی لو تا کہ پھر میں آپ کو میڈیسن دے سکوں۔"

وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھیں، جو ادیوا کو ذہنی ٹارچر دے۔

ادیوا نے خاموشی سے سوپ پیا۔میڈیسن کھائی اور لیٹ گئی۔مسز عمر نے اس کے کمرے کی لائیٹ آف کی دروازہ دھیرے سے بند کیا اور وہ واپس کچن میں چلی گئیں۔

اب ادیوا مسلسل اس ٹی وی سیریل کے بارے میں سوچتی رہی، یہاں تک کہ اس کو صفان علی کے ساتھ اپنی شادی کا دن یاد آ گیا۔

☆☆☆

اکتوبر ۲۴ بروز اتوار اس کی زندگی کا سب سے خوبصورت دن تھا، وہ بالکل ویسا ہی محسوس کر رہی تھی جیسے کوئی عام سی لڑکی کسی شہزادے کے محل کی شہزادی بننے جا رہی ہو، اگر خوشی کو ناپنے کا کوئی پیمانہ ہوتا، تو ادیوا عمر کی خوشی اتنی ہوتی کہ کسی پیمانے سے نہ ماپی جاتی۔صفان علی کی تمام تر خواہشات کا احترام کرتے ہوئے وہ انتہائی سادگی سے بیاہ کر اس کے گھر آ چکی تھی۔

اس کے گھر کی سیڑھیاں چڑھتے جب صفان علی اس کا ہاتھ تھام کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا، تو یوں لگا کہ جیسے بلندیوں کے سارے سفر میں صفان علی کا ساتھ محبت کرنے والوں کی تاریخ میں ایک احساس ہوگا۔ وہ محبت جو ایک تصور سے شروع ہوئی اور ایک حقیقت پہ آ ٹھہری اور حقیقت بھی وہ جو جاگتے میں نظر آنے والے خواب کی مانند لگی۔

عمر حیات کے بے حد اصرار پہ صفان علی نے ادیوا کے میکے سے صرف ایک بیڈ اور ڈریسنگ کا تحفہ قبول کیا تھا، وہ بھی بہت زیادہ اصرار پر۔ ورنہ Self made man اپنے اصول توڑنے کی اجازت کہاں دیتے ہیں کسی کو۔

سیڑھیوں کے ساتھ والا کمرہ جو پہلے ڈرائنگ روم تھا، اب وہ کمرا صفان اور ادیوا کو دیا جا چکا تھا۔ ادیوا پہلی بار صفان کے گھر آئی تھی۔ اسے تو بس صفان کا ساتھ مل گیا تھا، گھر کسی جنت سے کم کیسے لگتا۔ شادی پر بہت کم لوگ بلائے گئے، مگر جو بھی آئے صفان کی والدہ کو ایک بار ضرور کہہ کے جاتے۔

"آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ صفان کی بیوی کسی پری سے کم نہیں۔"

آج صفان اور ادیوا خود کو کسی اور ہی دنیا میں فیل کر رہے تھے۔

اگر چہ اودیوا، صفان کی طرح expressive نہیں تھی، مگر اپنے دل میں اس کے لیے ایک جنون رکھتی تھی اور جنون بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

صفان نے منہ دکھائی میں اودیوا کو ایک نازک سا گولڈ کا سیٹ دیا، اگر چہ سونے چاندی کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی ان کے درمیان، لیکن وہ سیٹ اودیوا کے لیے دنیا کا سب سے قیمتی اور خوبصورت تحفہ تھا۔

کتنا پیارا احساس تھا اپنے نام کے ساتھ اس کا نام۔ اودیوا صفان وہ دل میں کئی بار اپنا نام اس کے نام سے جوڑ کے دھراتی رہی۔

صفان اب اس کے اتنے قریب تھا کہ وہ اس کی سانسوں کی حدت اپنے چہرے پر محسوس کر سکتی تھی اور وہ اس کے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیے اسے اتنی محبت سے دیکھتا رہا اور اپنی محبت کا اظہار کرتا رہا، جو جذبات اس کی آنکھوں میں تھے وہ محبت کی انتہا پہ تھے۔

"اودیوا صفان دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی۔"

وہ دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر کرتی رہی۔

اگلے دن ولیمہ تھا، لہٰذا وہ اس کی مناسبت سے قریبی کسی پارلر سے تیار ہو گئی۔ اس کا برائٹ اورنج ویڈنگ ڈریس بہت جچ رہا تھا اور صفان بلیک تھری پیس میں کسی شہزادے سے کم نہ تھا۔

اسی طرح اگلے دو ہفتے وہ سب بہت مصروف رہے۔ صفان کی بہن

زویا کی رخصتی بھی صفان کی شادی کے ڈیڑھ ہفتے بعد رکھ دی گئی تھی۔

صفان ادیبا کو کہیں گھمانے نہ لے جا سکا سوائے مری کے۔وہ بھی وہ لوگ صبح گئے اور شام کو واپس آ گئے، کیوں کہ اگلے دن صفان کی جاب تھی۔

ادیبا کو کھانے بنانے نہیں آتے تھے،لہٰذا وہ اپنی ساس سے کچھ نہ کچھ سیکھتی رہتی اور رات کو جب سب واپس آتے ،تو ادیبا کی تعریفوں کے پل بندھنے لگتے۔

وہ بہت خوش تھی، جس کسی سے ملتی یہی کہتی۔

"میں دُنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی ہوں۔"

اور اس گھر کا ہر فرد جو صفان کے لیے تھا، اتنا ہی معتبر اور پیارا ادیبا کے لیے تھا۔اس نے اتنی خوبصورتی سے پورا گھر سنبھال لیا تھا۔ورنہ ادیبا نے اپنے گھر میں کبھی اٹھ کر پانی تک نہ پیا تھا۔صفان علی نے ادیبا کو محبت دینے میں کوئی کمی نہ چھوڑی تھی رات کو جب وہ تھکا ہارا آتا ،تو دونوں بہت دیر تک چھت پر واک کرتے۔اپنی جیب میں تھوڑے پیسے ہونے کے باوجود بھی وہ ہر روز آتے ہوئے ادیبا کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتا۔اسے Chocolate pasteries پسند تھیں اور صفان اکثر وہ لاتا۔کبھی پھول کبھی چاکلیٹ ادیبا یوں خوش ہوتی، جیسے وہ پوری دنیا اس کے قدموں میں لا ڈالتا ہو۔چیزیں چھوٹی بڑی نہیں ہوتی ان سے وابستہ خوشیاں چھوٹی بڑی ہوتی ہیں اور صفان

علی کی ایک مسکراہٹ بھی ادیوا صفان کی زندگی کی بڑی خوشیوں میں سے ایک تھی۔

وہ اکثر ادیوا کو پیار سے ادو بھی کہا کرتا تھا۔ جب اسے بالکل ویسا پیار آتا ادیوا کی معصومیت پر جیسے بچوں پہ آتا ہو۔

وہ immature تھی، معصوم تھی مگر صفان علی کے گھر کا ہر فرد اس کی معصومیت کا گرویدہ تھا۔ تیز طرار لڑکیوں والی برائیاں ادیوا میں نہیں تھیں۔ وہ کھری تھی۔ اپنی محبتوں میں اور یہی بات صفان علی کو اکثر سوچوں میں الجھا دیتی۔ وہ اکثر سوچتا اور پریشان ہو جاتا۔

"ادیوا! تم سب کا اتنا خیال رکھتی ہو...... امی نے بتایا کہ آج بھی زین اور مستان کے سارے کپڑے تم نے استری کر کے رکھے۔ گھر کی صفائی سے لے کر ہر کام تمھیں کرنا پڑتا ہے۔ پتا نہیں ...... میں نے تمھارے ساتھ ٹھیک کیا ہے یا غلط۔"

ادیوا نے فوراً صفان کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔

"صفان! میں سچ بول رہی ہوں۔ مجھ پہ کوئی بوجھ نہیں ہے۔ یہ میرا گھر ہے اور اس عمر میں امی اٹھ کے کام کریں، تو مجھے اچھا تھوڑی لگے گا۔"

ادیوا جو کر رہی تھی، دل سے کر رہی تھی۔ کبھی ہر ویک اینڈ پر وہ سب کے head massage کرتی، زین اور مستان کا ہر چیز کا خیال ایسے

رکھتی جیسے حادی اور اشعر کا۔ اس نے کبھی کسی چیز کا تقاضا کیا ہی نہیں تھا۔ کیوں کہ تقاضا وہاں ہوتا ہے، جہاں کوئی کمی ہو اور اس گھر میں اتنی محبتیں تھیں کہ کمی اور تقاضوں کے لیے کوئی جگہ ہی نہ تھی۔

شادی کے بعد اپنی پہلی سیلری ملتے ہی وہ ادیوا کے پاس آیا اور اسے پکڑاتے ہوئے بولا۔

"آج سے اس پر تمہارا حق ہے۔ اب اس گھر کے خرچوں کو تم مینج کرو گی۔"

ادیوا پہلے تو مسکرائی اور پھر اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"اچھا جی! اتنی بڑی بڑی باتیں۔"

اور دونوں مسکرانے لگے۔

"صفان! آپ مجھے بتائیں گے کہ آپ اپنی تنخواہ پہلے کسے لا کر دیتے تھے؟"

"امی کو دیتا تھا۔" صفان نے جواب دیا۔

"تو پھر جناب! ایسا کریں۔ یہ ابھی بھی امی کو ہی دیں۔ مجھے کچھ بھی چاہیے ہوگا، تو میں امی سے کہہ دوں گی۔"

صفان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے ادیوا کو بے اختیار

گلے سے لگالیا۔وہ واقعی بہت اچھی تھی، سب سے بہت الگ۔

شادی ہوئے دو مہینے ہونے والے تھے اور وہ اپنے میکے صرف ایک بار آئی ہوگی۔وہ بھی اسی وقت کچھ دیر بیٹھ کر صفان کے ساتھ واپس، اس لیے نہیں کہ صفان کو برا لگتا بلکہ ادیوا اپنے گھر کو اور گھر والوں کو زیادہ وقت دینا چاہتی تھی۔وہ اپنی ذمہ داریاں اچھی طرح سمجھتی تھی ، اس لیے کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتی تھی۔ادھر عمر حیات اور باقی گھر والے ادیوا کی پرابلمز کو سمجھتے تھے،اس لیے کبھی اسے insist نہیں کرتے تھے۔جب وہ خوشی سے بات کرتی یا ملنے آتی ،تو وہ بھی خوب انجوائے کرتے۔ادیوا خوش تھی،ان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی بات اہم نہ تھی۔

آج شام بھی وہ صفان کے ساتھ چھت پر واک کر رہی تھی، مگر صفان خلاف معمول آج بہت پریشان تھا اور چپ سا۔ادیوا کے بار بار پوچھنے پر اس نے بتایا۔

"ایک ورکر کی وجہ سے شاپ پر کچھ مسئلہ ہوگیا ہے اور کیش اچھا خاصا شارٹ ہے سیلز کی نسبت۔میں چوں کہ مینیجر ہوں،اس لیے ادائیگی بھی مجھے پڑی ہے اور اگلے کچھ مہینوں تک سیلری سے ۵۰٪ کٹتا رہے گا اور گھر کے خرچے کیسے مینج ہوں گے میں نہیں جانتا ادیوا!"

ادیوا نے اسے بہت تسلی دی اور پھر رات کو خود کافی دیر تک وہ اس

مسئلے کا حل سوچتی رہی۔وہ صفان سے کیا وعدہ بھی نہیں توڑ سکتی تھی۔ورنہ اس کے ایک فون کال سے پیسے اس کے اکاؤنٹ میں ہوتے۔عمر حیات نے ادیبا کے جہیز اور باقی کے سب پیسے اس کے لیے سیو رکھ دیے تھے۔بہت دیر سوچنے کے بعد کوئی حل نہ نکلا،تو وہ پریشان سی سوگئی۔

اگلے دن وہ اٹھی،تو صفان کی امی کے کچھ رشتے دار گھر آئے۔آنٹی کی کوئی بہت قریبی کزن جن سے غالباً کسی لڑائی کے بعد اب صلح ہوئی تھی اور آنٹی نے بہت پرجوش ویلکم دیا انھیں۔ادیبا صبح سے کچن میں بزی تھی اور مسلسل ایک ہی بات سوچ رہی تھی کہ دو مہینے میں آنٹی کے پانچ سو رشتے دار آچکے تھے،مگر انکل کا کوئی ایک بھی نہیں۔حالاں کہ شادی پر صفان کی چچا زاد بہنیں اور تایا کی فیملی سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔خیر بعد میں پتا چلا کہ وہ لوگ آنٹی کی ہی وجہ سے نہیں آتے،وہ بھی جب فون پر صفان کے چچا کی بیٹی ماریہ سے بات ہوئی تھی،تو ادیبا کو یہ سب معلوم ہوا۔

آنٹی کے ایک ہی بھائی تھے،جو کچھ عجیب سی پرسنالٹی کے مالک تھے۔ادیبا ہمیشہ ان کے سامنے کچھ uncomfortable ہو جاتی تھی۔انھوں نے اپنی بیوی کو ڈائیورس دے دی تھی اور وہ بھی دو بچوں کے باوجود اور آج کل آنٹی اپنے بھائی کے لیے رشتے ڈھونڈ رہی تھیں۔عمر میں تقریباً ۴۸ سال کے ہوں گے فردوس ماموں۔

صفان کے پاپا بہت ہی نائس تھے۔ادیبا کام ختم کر کے ان کے پاس اکثر جا کر بیٹھ جاتی۔ وہ بہت شفقت سے پیش آتے۔ بہت ہی attractive اور decent پرسنالٹی کے مالک تھے، لیکن ان کی بس ایک کمزوری تھی۔ آنٹی سے بے پناہ محبت کی وجہ سے ان کی غلط ہاں میں بھی ہاں ملا دیتے تھے۔۔بس یہی کمزوری تھی ان کی شخصیت میں۔

ادیبا کئی دنوں سے صفان کی اس پریشانی کو کم کرنے کا سوچ رہی تھی اور ایک آئیڈیا آ ہی گیا اس کی ذہن میں۔

صفان کو شاپ پر ہی کال کی۔

"صفان! آپ بزی تو نہیں؟ مجھے بات کرنی تھی آپ سے۔"

"ادیبا! میں تمھیں کال بیک کرتا ہوں ۱۰ منٹ میں ..... ابھی ایک کسٹمر ہے۔"

"جی! ٹھیک ہے۔"

ادیبا نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد فون کی گھنٹی بجی اور اب صفان اس سے مخاطب تھا۔

"صفان! وہ میں یہ سوچ رہی تھی کہ خود کو کہیں بزی کرلوں۔ میں گھر میں بہت بور ہو جاتی ہوں۔ آپ اجازت دیں، تو کوئی جاب کرلوں۔ ٹیچنگ وغیرہ...... وہ بھی صرف اپنا وقت گزارنے کے لیے، آپ بھی رات ۱۰ بجے

سے پہلے واپس آتے نہیں اور میں بور ہو جاتی ہوں بہت۔"

ادیبا نے کہانی بہت اچھی گھڑی تھی۔

صفان کو ذرا بھی شک نہ ہوا کہ اس کے پیچھے ادیبا کا کیا مقصد ہے۔

وہ ادیبا کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ حساس تھا، شاید اسی لیے اسے تشویش ہونے لگی۔ایک تو وہ پہلے ہی سے حساس تھا کہ وہ ادیبا کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہا اور اب یہ مسئلہ، اس لیے اس نے ادیبا کو کھلے دل سے اجازت دے دی۔وہ بہت خوش ہوئی۔

اس نے جابز اپلائے کرنی شروع کیں۔

جو گھر کے پاس سکولز تھے ان کا ایک تو نہ پے سکیل اچھا تھا نہ سکول کا سٹینڈرڈ۔ادیبا کو گھر سے دور ایک پرائیویٹ انگلش میڈیم سکول میں کمپیوٹر ٹیچر کی جاب آفر ہوئی اور سیلری بھی اچھی تھی۔لہٰذا صفان اور آنٹی، انکل کی اجازت سے اس نے جاب سٹارٹ کر دی۔صفان نے اسے پک اینڈ ڈراپ لگوا دی، تاکہ اسے بالکل کوئی تکلیف نہ پیش آئے۔محبت کے معاملے میں تو صفان بھی ادیبا سے پیچھے نہیں تھا۔دونوں ایک دوسرے کی ہر چھوٹی سی چھوٹی بات کا دل و جان سے خیال رکھتے۔

اب ادیبا کو سکول جاتے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور سکول سے واپسی پر وہ اس قدر تھک جاتی کہ بہت مشکل تین منزلہ مکان کی سیڑھیاں چڑھ کر گھر

میں داخل ہوتی، مگر اسے خوشی تھی کہ اس کی سیلری سے ایٹ لیسٹ گھر کے کچھ اخراجات منیج تو ہوں گے اور وہ پھر سے اپنے صفان کے چہرے پر وہ سکون اور اطمینان دیکھ سکے گی۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے ادیوا آنٹی کے عجیب وغریب رویوں کو محسوس کرنے لگی۔ وہ جب گھر میں داخل ہوتی، وہ آگے اپنی کزن اور ان کی جوان بچیوں کے ساتھ مصروف ہوتی اور پھر آہستہ آہستہ گھر کے کاموں پہ وہ ادیوا کو غیر محسوس طریقے سے ریلائز کروانے لگ گئیں کہ یہ بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ ادیوا سکول سے تھکی ہاری تین چار بجے گھر پہنچتی، تو آگے گھر کے ڈھیروں کام اس کے منتظر ہوتے اور وہ آنٹی کی کزن تو اب بلا ناغہ ان کے گھر براجمان ہوتیں۔ خیر ادیوا چپ چاپ کرتی رہی، مگر آہستہ آہستہ وہ اس رویے سے اندر ہی اندر ہرٹ ہوتی گئی۔

صفان سے بھی شیئر کرنے والی یہ بات نہ تھی اور اب تو آنٹی نے بہت ہی عجیب حرکت کرنا شروع کر دی۔ ادیوا کو کام سے عین اس وقت چھوڑنے کا کہتا جب صفان کے آنے کا ٹائم ہوتا۔ ادیوا کو کہا جاتا۔

"جاؤ! جا کر تیار ہو جاؤ...... فریش ہو جاؤ! صفان آ رہا ہوگا، خوش ہو جائے گا تمھیں تیار دیکھ کر۔"

اور وہ خوشی خوشی صفان کے لیے بجنے سنورنے لگتی۔

صفان جب بھی آتا ادیوا کو اپنے کمرے میں پاتا اور ماں کو کچن میں اکیلا کام کرتے دیکھتا۔ کچھ دن تک تو سب یوں ہی چلتا رہا اور صفان کے رویے میں بھی ادیوا کے لیے بدلاؤ آنے لگا۔ ادیوا بہت واضح طور پر یہ چینج فیل کرسکتی تھی، مگر وہ اس کی وجہ سمجھ نہ پا رہی تھی۔

اور پھر ایک دن وہ آیا اپنے اسی ٹائم پر اور ادیوا اس کے آنے سے بارڈلی دس منٹ پہلے اندر آئی ہو گی۔ آنٹی کے ساتھ کچن میں ساری ہیلپ کروا کر، کیوں کہ آنٹی کھانا خود بنانا چاہتی تھیں۔ باقی تو سارے کام ادیوا ہی کرتی تھی۔

صفان علی کا معمول ہوتا تھا کہ گھر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے کمرے میں آتا تھا، مگر اس دن وہ سیدھا کچن میں گیا اور زور زور سے بولنے لگا۔

"امی! آپ پہ فرض ہے کہ اس گھر کے سارے کام آپ ہی کریں گی۔؟؟؟؟ ادیوا......ادیوا......!"

وہ زور زور سے چلانے لگا۔ ایسا اس کی زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ آج تک کسی نے اتنے غصے میں اس کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ ڈری سی کچن میں داخل ہوئی۔

"جی صفان......!"

وہ بہت سہم گئی تھی۔

"آپ کو بناؤ سنگھار سے فرصت مل گئی ہو، تو ذرا یہاں بھی نظر کرلیا کریں۔ یہ میری ماں ہے ...... اس گھر کی نوکرانی نہیں ہے۔ you understand۔"

ادیوا سر جھکائے کھڑی تھی۔

"دوبارہ میں یہ نہ دیکھوں، اب مجھے سمجھ آئی آپ کی جاب کرنے کی وجہ۔ گھر کے کاموں سے اتنی ہی تنگ تھیں، تو صاف صاف بتا دیتیں نا! یہ ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

وہ ادیوا کو حقارت سے دیکھتا ہوا تیزی سے اسے پیچھے دھکیلتا ہوا باہر نکل گیا۔

ادیوا وہیں پتھر بنی رہ گئی اور پھر دیوار کا سہارا لے کر وہیں بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"کیا یہ وہی صفان علی تھا؟ کیا وہ یہ سب ڈیزرو کرتی تھی؟ اس طرح کا لہجہ؟"

ادیوا ٹوٹ کر رہ گئی۔ یوں لگا کہ زندگی بھر کی کمائی ایک لمحے میں چھن گئی ہو۔ سارا سفر اسے بے منزل سفر لگا۔

"وہ وہی صفان علی تھا؟"

وہ بار بار خود سے ایک ہی بات پوچھتی رہی۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے بے اختیار روئی کہ اچانک اسے خیال آیا آنٹی نے کیوں نہیں کہا۔

"بس تمھارے آنے سے دس منٹ پہلے ادیوا کو میں نے بھیجا تھا۔ وہ کیوں نہیں بولیں؟"

"کیوں نہیں کہا صفان کو کہ میں پورے دن میں صرف کھانا بناتی ہوں اور اس میں بھی ادیوا میری مدد کرتی ہے۔؟ کیوں نہیں کہا کہ گھر کے برتن' کپڑے' صفائی سے سب کچھ ادیوا اکیلی کرتی ہے؟"

ادیوا نے جیسے ہی آنکھوں سے ہاتھ اٹھا کر آنٹی سے پوچھنا چاہا، تو وہ وہاں سے پہلے ہی جا چکی تھیں۔ ادیوا پہ مزید حیرانیوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"آنٹی نے مجھے اٹھایا، نہ چپ کرایا۔ حالاں کہ وہ تو جانتی تھیں ناں کہ کیا حقیقت ہے۔ صفان کو نہیں بتایا، تو کوئی بات نہ تھی، مگر مجھے تو چپ کرواتا' آنسو پونچھنا بنتا تھا ناں ان کا؟"

ادیوا وہاں سے اٹھی اور آنٹی کے کمرے میں چلی گئی اور یہ دیکھ کے حیران رہ گئی کہ وہ خود مسلسل روئے جا رہی تھیں اور انکل انھیں چپ کروا رہے تھے۔ ادیوا کو اتنے غصے سے انکل نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ غصہ اور شدید نفرت ان کے چہرے پہ واضح تحریر تھی۔ آنٹی نے ادیوا کے بارے میں کچھ نیگیٹیو بات

کی تھی انکل سے۔جس سے کہ اویوابلکل لاعلم تھی ، وہ وہاں ایک پل نہ ٹھہر سکی ، دوڑتی ہوئی چھت پہ چلی گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔اتنی شدید سردی میں وہ چھت پر بیٹھی روتی رہی۔

"کیا یہ وہی گھر تھا؟ کیا یہ وہی لوگ تھے؟ کیا ان لوگوں کے لیے میں نے قربانیاں دیں؟ کیا اس دن کے لیے میں نے وہ جاب کی؟ جس لڑکی نے کبھی زندگی میں جاب نہیں کی۔اس گھر کی خوشحالی کے لیے گھر سے قدم باہر نکالا ،تو گناہ کر دیا؟ بہتر ہوتا کہ گھر رہتی۔آرام کرتی ، وہی گھر کے کام کر کے پورا دن سکون سے سوتی۔ڈبل ، ڈبل ڈیوٹیاں دے کر بھی یہ سلوک اس کے ساتھ۔"

وہ ہر ایک کی نفرت سہ سکتی تھی مگر صفان علی کا تو غصے سے پکارا گیا نام ہی اس کی سماعتوں میں جم گیا تھا۔باقی تو جو بھی اس نے کہا، بعد کی باتیں تھیں۔

"کیا وہ مجھے اتنا ہی جانتا تھا؟ میں نے گھر کے کاموں سے جان چھڑانے کے لیے گھر سے باہر قدم نکالا تھا؟؟ صفان علی! کیوں ہوئے تم اتنے بدگمان مجھ سے۔"

وہ روتی جا رہی تھی۔دو گھنٹے گزر چکے تھے اسے وہاں بیٹھ کر روتے ہوئے۔

"اٹھو! یہاں سے۔"

یہ صفان کی آواز تھی، مگر لہجہ......؟

وہ گھٹنوں پر سر رکھے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ آنکھیں رو رو کر سوج رہی تھیں۔

"تمھاری ہمت کیسے ہوئی میری ماں سے زبان درازی کرنے کی؟"

ادیوا اس کی بات کو سمجھ ہی نہ پائی۔

اب صفان اور اس کی ماں دونوں ہی اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"زبان درازی؟ میں نے؟"

ادیوا نے اسی بے یقینی کی کیفیت میں تھی کہ اچانک صفان علی کی گرجتی آواز اس پہ بجلی کی طرح گری۔

"تم جاہل عورت......"

اس کے آگے وہ کیا کیا کہہ رہا تھا۔ ادیوا کی سماعتیں کچھ سننے کے قابل نہ رہیں۔ وہ چیختا چلاتا رہا اور ادیوا سامنے والی دیوار میں نظریں گاڑے پتھر بنی کھڑی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اسے بازو سے پکڑتا، کھینچتا ہوا، گھسیٹتا ہوا نیچے لے گیا اور اسے کمرے میں لا کر پھینک دیا۔ ادیوا کو لگا کہ اس کے جسم سے روح نکل گئی ہے۔ وہ مردہ ہے اس کی لاش پہ چیخ چنگھاڑ رہا ہے، وہ اپنی سب حسیں کھو چکی ہے۔ بینائی جم گئی ہے۔ اس کی آنکھیں صفان علی کی

حقارت کے علاوہ کچھ اور دیکھ نہیں پا رہی تھیں۔

اور اب کمرے میں تین لوگ موجود تھے۔صفان علی اس کی ماں اور باپ باری باری سب اس سے گالی گلوچ کر کے اپنے دل کو ٹھنڈا کر کے چلے گئے۔اب باری تھی صفان علی کی،اس نے دروازہ بند کیا اور سامنے بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔بالکل کسی بے رحم حاکم کی طرح اور وہ مظلوم رعایا کی طرح نیچے فرش پر بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔

اب صفان علی پھر سے اسی لہجے میں مخاطب ہوا۔

''ہم تنگ آ چکے ہیں تمھاری immaturity اور so called معصومیت سے۔ come on کب بڑی ہو گی تم۔اوپیا! اگر امی نے تمھیں چھایا آنٹی کے لیے چائے بنانے کا کہہ دیا،تو تم نے اتنی بدتمیزی کی؟ تم کیا سمجھتی ہو اپنے آپ کو،کیا صرف تمھارا اسٹیٹس ہے۔ ہماری کوئی عزت نہیں ہے؟ صبح تیار رہنا...... تمھیں تو تمھارے گھر چھوڑ کے آؤں گا۔بہت ہو گیا تماشا......''

اب وہ سب حقیقت جان گئی تھی۔

''چھایا آنٹی تو آج آئی ہی نہیں تھیں اور میں نے بدتمیزی کی،وہ بھی صفان علی کی ماں سے؟''

ذہن بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔اب اس کے ذہن میں صفان علی کے

الفاظ بار بار کونجنے لگے۔

"صبح تیار رہنا! میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کے آؤں گا؟"

"میرا گھر؟ میرا گھر؟ اگر وہ میرا گھر ہے، تو یہ کس کا گھر تھا؟ میرا گھر نہیں تھا، تو مجھ سے ذمہ داریاں نبھانے کی امید کیوں تھی؟ جب یہ گھر ہی میرا نہیں تھا تو؟"

وہ چاہ کے بھی آنسو نہ روک پائی۔

اسے لگا کہ اس کا دماغ سوچنے سمجھنے سے بالکل محروم ہو چکا ہے۔ وجود بالکل شل ہو چکا ہے۔ ساری مسافتیں، ساری ریاضتیں رائیگاں گئی ہیں۔

صفان علی کب کا سو چکا تھا۔ اس کی تکلیف، اس کے درد سے بالکل بے خبر ہو کر۔ ادیبا مسلسل اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ دور بیٹھی ادیبا خود کو صفان کے بے قصور ہونے کا یقین دلاتی رہی۔

محبت بھی عجیب چیز ہے۔ سہنے پر آئے، تو تذلیل بھی سہہ لیتی ہے، مگر جدائی کسی صورت گوارا نہیں کرتی۔ اب ادیبا مکمل طور پر ڈیپریشن میں جا چکی تھی، جو سلوک اس کے ساتھ پچھلے دو ہفتوں سے ہو رہا تھا، وہ بھی زہر بن کے اس کے ذہن میں گھلتا رہا اور اب جو یہ سب ہوا دماغ کی ساری شریانوں کو چیر گیا تھا۔

"صبح تیار رہنا! میں تمھیں تمھارے گھر چھوڑ آؤں گا۔"

الفاظ کیا تھے؟ کیا تھا اس کا مطلب؟ صفان علی ادیوا سے جدا ہو کر رہ سکتا تھا؟ ادیوا کا وجود کچھ بھی نہیں تھا؟

"ادیوا صفان سے الگ کر دی جائے گی صبح۔"

وہ بار بار یہ سب دہراتی رہی۔ نیم پاگل سی ہوتی گئی اور پھر ایک دم سے اٹھی، اپنے بیگ سے پیچ کٹر نکالا اور کلائی کی آخری تہہ تک پھیرتی چلی گئی۔

"تم سے الگ ہونا میرے لیے اس درد سے زیادہ دردناک ہوتا صفان علی! اس لیے میں نے تھوڑے درد کو چن لیا ہے۔"

اور پھر کچھ ہی دیر میں خون پورے فرش پر پھیلنے لگا۔ وہ اٹھی اور آہستہ سے صفان علی کے قدموں کی طرف سر رکھ کر لیٹ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بے حس و حرکت ہوئی اور پھر اپنے حواس کھو بیٹھی۔

ایسے ہوتے ہیں اپنی وفاؤں کا مان رکھنے والے، مرنا بھی چاہتے ہیں، تو اسی کے قدموں میں سر رکھ کے، جو زندہ رہنے کے بھی حوصلے چھین لیتا ہے۔

آنکھ کھلی، تو ادیوا سرکاری ہسپتال کے آپریشن تھیٹر میں تھی۔ دو ڈاکٹرز اس کی کلائی کو تھامے اس کی سکن میں سے نیڈل گزار رہے تھے اور وہ

آنکھیں کھولے اس درد کو محسوس کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

کبھی کبھی محبت آپ کو ایسے درد سے نواز دیتی ہے کہ آپ کی آنکھوں کے سامنے آپ کے جسم کے ٹکڑے بھی کر دو، تو بھی آپ درد کی وہ شدت کبھی محسوس نہیں کر سکتے، جو محبت کرنے والوں کے لہجے بدلنے سے ہوتی ہے۔

کچھ ہی فاصلے پر صفان علی کھڑا تھا۔ جیسے ہی ڈاکٹرز سٹچنگ کر کے پیچھے ہٹے۔ صفان علی آگے بڑھا اور ادیوا کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"ادیوا! تمھیں پتا ہے کہ میں اس سے زیادہ محبت نہیں دے سکتا تھا تمھیں اور پھر بھی تم نے یہ سب کیا۔ اب شاید میں کبھی تم سے محبت کرنے کا حوصلہ نہ کر پاؤں۔"

صفان علی کے یہ الفاظ بالکل ایسے تھے جیسے ایک مردہ انسان پر پھر سے چھریاں چاقو ایک ساتھ چلا دیے جائیں۔ ایک مرے ہوئے انسان کو مار کر کیا راحت ملی تھی، ادیوا نہیں جانتی تھی۔

اب اسے وارڈ میں شفٹ کیا گیا۔ دو خون کی بوتلیں اس کے دونوں ہاتھوں کی وینز میں لگا دی گئی تھیں۔ بہت مشکل سے ادیوا کی جان بچائی گئی تھی۔ ہسپتال میں صرف صفان اور اس کی والدہ موجود تھے اور اسے کوئی دکھائی

نہ دیا۔اب اسے فکر ہو رہی تھی کہ اس کے گھر سے کوئی کیوں نہیں آیا۔جس کو بعد میں صفان نے کلیر کر دیا کہ ادیوا کے چھوٹے چچا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور ان کی موت واقع ہو گئی،اس لیے رات ہی کو عمر حیات اور باقی سب گھر والے کراچی روانہ ہو گئے تھے۔ادیوا کو انھوں نے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا ،اس لیے بغیر اطلاع دیے ہی وہ روانہ ہو گئے۔

تین دن بعد اسے ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا گیا،مگر ادیوا سہارے کے بغیر نہ اٹھ کے کھڑی ہو سکتی تھی،نہ چل سکتی تھی۔اس کے جسم سے بہت بھاری مقدار میں خون ضائع ہو چکا تھا۔اب اسے کم از کم چھ ماہ تک ملٹی وٹامنز کھانا تھیں۔پھر کہیں جا کر اس خون کی اور ریڈ سیل کی کمی پوری ہوتی۔

اب وہ اپنے کمرے میں تھی،صفان علی اسے گھر لے آیا تھا۔ادیوا کے بہت التجا کرنے پر اسے نے ادیوا کے والدین کو کچھ نہ بتایا تھا۔یہ بھی بہت احسان تھا اس کا۔کیوں کہ ادیوا ابھی بھی اس کی عزت کی خاطر اور جو مقام اس کا ادیوا کی فیملی کے سامنے تھا،وہ اسے کبھی گرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

آج اس بات کو ہوئے ساتواں دن تھا۔بے اعتباری کا یہ عالم تھا کہ ادیوا کو اس کے کمرے میں ایک منٹ بھی اکیلا نہ چھوڑا جاتا۔کبھی آنٹی تو کبھی انکل بہت ناگواری سے اس کے سامنے بیٹھے رہتے۔ادیوا تو پہلے ہی اپنے کیے پہ شرمندہ تھی،لیکن ایک بات پہ تو سکون تھا کہ ادیوا صفان علی کے

گھر میں تھی ۔ وہ اسے خود سے الگ نہیں کر رہا تھا۔شاید کبھی کبھی جان سے پیارے انسان کو جان دے کے اپنی محبت کا یقین دلانے کی بھی نوبت آجاتی ہے، لیکن صفان علی پورا دن اپنی جاب پر بزی رہتا۔ وہ اکثر سوچتی کیا ایسی ہی تنہائی کے لیے وہ اسے گھر لایا تھا۔ ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ صفان کا فون آیا اور آنٹی موبائل اٹھا کر دوسرے روم میں لے گئی اور پھر جانے کیا بات ہوئی ان کے بیچ کہ تھوڑی ہی دیر بعد صفان گھر داخل ہوا ۔ آج وہ یقیناً half leave پر آیا تھا۔

اودیا کو لے کر وہ لوگ پہلے کسی پیر صاحب کے پیر خانے لے گئے، جہاں انھوں نے اودیا پر کچھ اثرات کی تصدیق کی اور پھر وہ دونوں اسے لے کر اسی سرکاری ہسپتال کے .psychology dept میں آ گئے اور اب اودیا منتظر تھی کہ صفان علی کے ہر ظلم کی انتہا دیکھے۔ اس انسان کو اب اودیا پر کوئی ظلم کرتے ہوئے ایک لمحے کو بھی خدا کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا اور آخر کار وہی ہوا۔

وہ اسے دماغی امراض کے وارڈ میں ایڈمٹ کروا گیا۔

کیا یہ تھی محبت؟ یہ تھا جنون؟ اور یہ تھا صفان علی کا اصل روپ؟ اودیا بس یہی چاہتی تھی کہ وہ اسے زندہ درگور کرتا رہے اور وہ اس کے ہر ظلم کو سر آنکھوں پر رکھ کے سہہ جائے۔ مگر سچی محبت کرنے والے ہمیں اتنی آسانی

سے اپنا آپ زندہ درگور کہاں کرنے دیتے ہیں۔ حادی اور مسز عمر کو اطلاع ہو چکی تھی اور وہ دونوں آنا فانا بھاگے ہوئے آئے۔

ادیبا کی زرد رنگت اور کلائی پر ہوئی سٹیچنگ سب کچھ اتنا خوفناک تھا کہ مسز عمر زارو قطار رونے لگیں۔ صفان کی والدہ سامنے بیٹھی انھیں دیکھ کر فوراً وہاں سے چلی گئیں۔ جیسے کوئی مجرم اپنے پکڑے جانے کے خوف سے بھاگ جاتا ہے۔

ادیبا کو ڈسچارج کروا دیا اور حادی اور مسز عمر اسے گھر لے آئے۔ مسز عمر ادیبا سے چھپ کر روتی رہیں۔ ادیبا کو ابھی بھی چلنے پھرنے کے لیے سہارے کی ضرورت تھی۔ اس کا جسم انتہائی کمزور اور لاغر ہو چکا تھا۔

عمر حیات نے اشعر اور حادی کو بٹھا کر سمجھایا۔

"آپ دونوں میں سے کوئی اس مسئلے میں نہیں بولے گا۔ میں خود بات کروں گا صفان علی سے۔"

"لیکن پہلے ادیبا کو اس ڈپریشن سے نکلنے دو۔ پھر ہی وہ کوئی بہتر فیصلہ کر پائے گی۔"

صفان علی کے گھر میں سے کسی فرد نے بھی ادیبا کی خیریت دریافت نہ کی۔ باقی لوگ تو بہت بعد کی بات تھی، خود صفان علی نے اپنی بیوی کی حالت جانتے ہوئے بھی ایک فون تک نہ کیا۔

کچھ لوگ ہمیں عین اس وقت اکیلا چھوڑتے ہیں، جب ہمیں ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ان کی ٹائمنگ اتنی پرفیکٹ ہوتی ہیں کہ جیسے وہ ہمارے دکھ، ہماری خوشی کے منتظر ہی تھے کہ ملے اور وہ اٹھ کے چل دیں۔

دو دن بعد صفان علی، عمر حیات کے بار بار بلانے پر گھر آیا۔اس نے کسی بات کا کوئی ٹھیک سے جواب نہ دیا اور سیدھا ادیوا کے کمرے میں چلا گیا۔وہ سونے کی کوشش کررہی تھی، کیوں کہ ذہن پر مسلسل بوجھ کی وجہ سے اسے بہت کم نیند آتی تھی۔

"صفان! آپ؟"

دروازے کی آہٹ سے اسے صفان کی موجودگی کا ادراک ہوا۔اس نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن ہمت نہ کرپائی۔

"لیٹی رہو ادیوا! کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟ مجھے امید ہے اب تم بہت سکون میں ہوگی، کیوں کہ یہاں تم پر کوئی ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ہے۔"

"اوہ تو......"

صفان علی آج اس کی روح کو طنز کے تیروں سے چھلنی کرنے آیا تھا۔جسمانی اذیت کے بعد اصولاً اب روح کی باری تھی۔ادیوا ترس رہی تھی کہ وہ اس کے منہ سے ایک بار بس ایک بار محبت کا اقرار سنے، تو وہ اس کے

ساتھ اٹھ کر چل پڑے۔

جب محبت اپنے اقرار کا حوصلہ دیتی ہے، تو انسان اپنے اندر طوفانوں سے لڑنے کی طاقت بھی محسوس کرنے لگتا ہے اور ادیبا اس وقت اس کے اسی اقرار کی منتظر تھی، جو اس کے سب گھاؤ بھر دے۔

مگر وہ کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ اب وہ ادیبا کو دیکھتے رہنے کی بھی خواہش مٹا چکا تھا، مگر ادیبا کی آرزوؤں کے سمندر تھے کہ خالی ہی نہ ہوتے۔ ایک کے بعد ایک آرزو اور پھر اسی آرزو کو حسرت بنتے دیکھنے کی تکلیف......

کتنا کچھ سہنا سکھا دیتی ہے نا محبت......

"صفان علی! تمھیں خبر ہی کیا ہے بے بسی کی اور اس کی انتہا سے تو یکسر ناواقف ہو تم۔ کبھی منجدھار میں ڈوبتی کشتی کو دیکھا؟ کسی گرداب میں اڑتے ہوئے تنکوں کو بکھرتے دیکھا؟ کتنا بے بس ہوتا ہے ان کا وجود، وہ اپنی تمام تر طاقت لگا کے بھی اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ خود کو بپھری موجوں کے حوالے کر دینا، تند و تیز آندھیوں کو سونپ دینا' بھی ہے بے بسی اور تمھاری محبت کے معاملے میں، میں اس کی انتہا پر ہوں۔"

کاش وہ یہ سب اس سے کہہ سکتی۔

گھر کا ہر فرد ایک اذیت سے گزر رہا تھا۔ ہر کوئی اسی سوچ میں تھا کہ آخر صفان علی کے گھر ایسا کیا ہوا تھا کہ ادیبا کو اپنی ویٹر کاٹنا پڑی؟ مگر

حیات کے گھر گزرا پوری زندگی میں سے کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہ تھا کہ اودیوا نے کوئی ایسا انتہائی قدم اٹھایا ہو۔ وہ تو انجکشن لگانے کی تکلیف سے کانپ جانے والی لڑکی تھی، لیکن انتہا کی محبت کسی جنون سے کم نہیں ہوتی ...... شاید وہ ایسی تکلیف سہنے کا حوصلہ بھی دے دیتی ہے جو انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔

اودیوا اپنے بیڈ پر ٹیک لگائے بیٹھی اپنی کلائی پر بنے سٹیچز کے نشان دیکھتی رہی۔ ایک دم سے اسے صفان علی کی وہ بات یاد آئی۔ جب مری جاتے ہوئے راستے میں سے موتیے کے گجرے لیتے اور اس کی کلائی پہ پہناتے ہوئے اس نے کہی تھی۔

"اودیوا! کتنے بے داغ ہیں تمہارے ہاتھ...... تمہاری کلائیاں...... تمہارا پورا وجود ایک نور کا ہالہ ہے اور میں کتنا خوش نصیب ہوں نا کہ پوری دنیا چھوڑ کے یہ نور صرف مجھے عطا کیا گیا ہے۔"

صفان کی بہن کی رخصتی کے دو دن بعد وہ اسے مری لے گیا تھا اور اسی دن شام کو وہ گھوم پھر کر واپس آ گئے، مگر وہ دن زندگی کے خوبصورت دنوں میں سے ایک تھا۔ کتنی حیرت کی بات تھی نا۔ صفان علی کے لیے وہ کلائی داغدار ہو چکی تھی، مگر وہ شخص روح پہ لگے گھاؤ اور ان کے ان مٹ داغ دیکھنے کی طاقت رکھتا ہی نہیں تھا۔ وہ اس بینائی سے شاید محروم تھا، جو انسان کے اندر کے زخموں کو دیکھ سکے۔

دو ہفتے گزر گئے تھے۔ صفان علی کے گھر سے کوئی فون آیا اور نہ تو وہ خود آیا۔ اب اودیوا اٹھ کے چل پھر سکتی تھی۔ وہ کچن میں آئی، مسز عمر کسی کام میں مصروف تھیں۔

''ماما! صفان سے کوئی رابطہ ہوا...... میں اسے جب بھی کال کرتی ہوں۔ وہ ڈس کنیکٹ کر دیتا ہے۔ آپ کا یا پاپا کا کوئی رابطہ......؟''

''اودیوا! میری بات سنو!'' مسز عمر نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی بات کاٹ دی۔ ''کیا ہم سب کی اہمیت بالکل ختم ہو چکی ہے تمہاری زندگی سے؟ کیا ہمیں کوئی حق نہیں اودیوا! کہ ہم جان سکیں کس وجہ سے ہماری پھول سی بچی کی یہ حالت ہوئی؟ یقین کرو! ہادی تمہیں جس دن ہاسپٹل سے لایا تھا، سارے راستے روتا آیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، ٹھیک سے کھانا کھاتا ہے نہ کسی سے بات کرتا ہے۔ جاب سے آ کر سیدھا اپنے روم میں چلا جاتا ہے۔ اشعر اور تمہارے پاپا دونوں کی حالت اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ صفان کی والدہ نے جو بی ہیو ہمارے ساتھ ہاسپٹل میں کیا تھا، وہ تم سے کچھ چھپا ہوا نہیں۔ باقی کسر صفان علی نے پوری کر دی۔ اس دن جس انداز سے وہ تمہارے پاپا اور میری باتوں کو نظر انداز کر کے تمہارے کمرے میں گیا، وہ کبھی بھی قابل تسلیم نہیں ہے۔ اودیوا! اس انسان کو اپنی قدر محسوس کراؤ۔ اپنی عزت نفس اپنی Dignity کو اس کے قدموں کی دھول مت

بتاؤ۔ خدا کا واسطہ تمھیں۔ بھیک مت مانگو اس سے ...... کہیں یہ نہ ہو کہ تمھارے کشکول میں وہ ہمدردی کے سکے بھی نہ ڈالے۔ اتنا مت گراؤ کہ ہم سے تمھاری شخصیت کی پہچان بھی مشکل ہو جائے۔"

اور مسز عمرا اپنے آنسو چاہتے ہوئے بھی نہ روک پائیں۔

وہ سب کچھ چپ چاپ سنتی رہی ...... کہنے کو تھا بھی کیا۔ کیا یہ سمجھاتی

"بے لوث محبت کرنے والوں اور بھیک مانگنے والوں میں سے کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ دونوں آس لگائے در پہ بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی نفرت سے دھتکار بھی دے۔ دروازے بند بھی کر دے، تو بھی دل سے دعائیں ہی نکلتی ہیں۔ دونوں چاہ کے بھی بددعا نہیں دے سکتے اور عزت نفس، خودداری کہاں ہوتی ہے مانگنے والوں میں؟ وہ تو اپنی انا اپنی پہچان سب کچھ کھو چکے ہوتے ہیں۔ کچھ پانے کی آرزو میں ...... اور ماما ......! آرزوئیں تو انسان کو جلا کر راکھ کر دیتی ہیں، کسی بنجر زمین کی ویرانی کی طرح۔ جہاں بارشیں برسنے سے بھی کوئی پھول کوئی سبزہ نہیں اگتا، ایسی ہی بنجر ہو جاتی ہیں دل کی زمینیں بھی اور صفان علی ادیوا کے لیے وہی آرزو تھا، جو جلا کر راکھ کر گیا، تو ادیوا کے دل کی زمین بھی ویسی ہی بنجر ہو جائے گی جس پر پھر سے کوئی آرزو، کوئی امید نہیں اگ سکے گی۔"

وہ دل ہی دل میں خود سے باتیں کرتی گئی۔

☆☆☆

"ادیوا! دیکھو تو کون آیا ہے۔"

وہ ایک دم سے چونک کر اٹھ بیٹھی۔ایک بار پھر ماضی سے اپنا آپ گھسیٹتی ہوئی شل وجود کے ساتھ وہ آنکھیں کھول کے چہرے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔

"ارے ماہا! what a great surprise"

وہ اٹھ کے ماہا کے گلے لگ گئی۔ ماہا تین سال سے امریکا میں تھی۔ اس کی شادی اس کے کزن سے ہوئی تھی، جو کہ وہاں رہائش پذیر تھا۔

"تم لوگ گپ شپ کرو...... میں کھانے کا ارینج کرواتی ہوں۔"

یہ کہہ کر مسز عمر نیچے کچن میں آ گئی۔ وہ دونوں بہت عرصے کے بعد ملی تھیں۔ ماہا بالکل ویسی کی ویسی ہی تھی اور ادیوا کے چہرے پر واقعی پرانی مسکراہٹ پھر سے آ گئی تھی۔

کچھ دیر باتوں کے بعد ماہا نے اپنے موبائل سے ہسبنڈ اور بیٹے کی تصویریں ادیوا کو دکھائیں۔ بہت اچھا کپل تھا۔ ادیوا نے ماہا کو موبائل واپس دیتے ہوئے ماہا کے stay کا پوچھا۔ وہ فور ویکس کی vacation پر آئی تھی۔ ماہا کو ادیوا کے ساتھ ہونے والے حادثے کی خبر تھی، اس لیے اس نے

صفان علی کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ کافی دیر یونیورسٹی اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ دونوں لان میں ٹہلتی رہیں اور پھر دوپہر کے کھانے کے بعد ماہا واپس چلی گئی۔

ادیوا نے آج فجر کی نماز بھی نہیں پڑھی تھی۔ رات کو وہ بہت دیر تک وہی سب سوچتی رہی اور وہیں بیڈ سے ٹیک لگائے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ نماز نہ پڑھنے کے اثرات اسے واضح طور پر محسوس ہو رہے تھے۔ دل کچھ ضرورت سے زیادہ بے چین تھا۔ ادیوا نماز کی پابند نہ تھی، مگر صرف فجر کی نماز کے لیے وہ کوشش کر کے پڑھ لیتی تھی اور دل سکون میں آ جاتا تھا۔

"ادیوا! تمھارے ماموں کی فلائٹ ہے پرسوں جمعرات کو شام چار بجے کی۔ اگر تم بہتر فیل کرو، تو میرے ساتھ مارکیٹ چلو۔ وہ میں سوچ رہی تھی ان سب کے لیے کچھ presents لے لیں۔"

"جی ماما! ٹھیک ہے میں ضرور چلوں گی۔ آپ بتا دیجیے گا کہ کب جانا ہے۔"

وہ یہ کہہ کر کمرے میں واپس آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسلام آباد کی ایک بڑی مارکیٹ پہنچ گئی۔ کچھ کپڑے اور پرفیومز لے کر وہ واپس گھر آ گئے۔

ادیوا کو کچھ تھکاوٹ محسوس ہوئی اور وہ آرام کے لیے کمرے میں آ گئی۔

کبھی کبھی یادیں انسان کا ایسے پیچھا کرتی ہیں کہ اسے پاتال میں

سے بھی ڈھونڈ لاتی ہیں۔ آپ چاہیں مر مر کی جئیں یا جی جی کر مریں۔ وہ اپنے ظلم میں کسی صورت کمی نہیں کرتی۔

ادیوا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ رات کی تاریکیاں جتنی بھی گہری ہوں یادیں اس کے وجود کا سراغ لگا کے اس تک پہنچ جاتی تھیں۔ اور ابھی بھی اس کے کمرے میں کسی بن بلائے مہمان کی طرح منتظر بیٹھی تھیں۔

☆☆☆

اس کھیل تماشے میں پورا ایک مہینہ گزر گیا تھا وہ لوگ ادیوا کو اس بُری طرح سے زندگیوں سے بے دخل کر چکے تھے کہ جیسے اس کا وجود کچھ تھا ہی نہیں۔ ذین اور منان جنھیں اس نے بھائیوں سے زیادہ پیار دیا۔ ادیوا کی کال دیکھتے اور ڈس کونیکٹ کر دیتے۔ انکل جن سے اپنے پاپا کی طرح پیار کیا کرتی تھی، وہ بھی ادیوا کی ایک بار بھی بات سننے کو تیار نہ تھے۔ جب انسان نے کوئی غلطی کی ہو تا، تو وہ بُرے رویوں پر ہنس کے صبر کر لیتا ہے، لیکن جب اسے اپنا قصور ہی پتا نہ ہو، تو پھر صبر کرنا اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے، جتنا بند قبر میں سانس لینا اور اس وقت اس کا پل پل کسی قبر میں ہی گزر رہا تھا۔

''صفان علی! کہاں ہیں...... میں ان کی مسز بات کر رہی ہوں۔''

آج اس نے اس کی شاپ پر کال کرنے کی ہمت کر ہی لی۔ وہ واضح طور پر سن سکتی تھی، ہولڈ کے دوران دوسری طرف سے صفان علی کسی سے

مخاطب تھا۔

''کہہ دو میں نہیں ہوں۔''

اور اودیوا میں مزید سننے کی ہمت نہ تھی۔ اس نے فون بند کر دیا۔

آخر کوئی کسی سے اتنی نفرت کیسے کر سکتا ہے اور وہ بھی اس سے کہ جس سے کبھی انتہا کی محبت کا اقرار کیا ہو؟

عمر حیات کے صبر کی انتہا ہو چکی تھی۔ انھوں نے بیگم کو صفان علی کے گھر جانے کی ہدایت کی اور اشعر کو ساتھ جانے کا کہا۔ وہ خود نہیں جانا چاہتے تھے کیوں کہ وہ اپنا غصہ کنٹرول میں اکثر نہیں رکھ پاتے تھے اور حاوی بھی ایسے ہی Temprament کا تھا۔

اشعر اور مسز عمر گھر سے نکل ہی رہے تھے کہ اودیوا بھاگتی ہوئی آئی۔

''ماما...... ماما......! مجھے بھی جانا ہے۔ پلیز!''

وہ بہت اصرار کر کے ان کے ساتھ چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ وہاں پہنچ گئے۔

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے، تو اودیوا اپنے کمرے کے سامنے آ کر رک گئی۔ اس کے قدم خود بخود تھم گئے۔

اور کمرے کا دروازہ باقاعدہ کھلا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں نظر آنے والے چینج کو محسوس کر سکتی تھی۔ سب سیٹنگ بدلی جا چکی تھی۔ حیرتوں کے پہاڑ

تھے کہ ٹوٹے چلے جا رہے تھے۔آ گے گئے ،تو کچن میں موجود آنٹی کی کزن کی بیٹی سعدیہ کچھ بنانے میں مصروف تھی۔گھر کی رونقیں تو باہر والوں سے آباد تھیں ،پھر کیسے ضرورت محسوس ہوتی کہ ادیوا صفان کو گھر واپس لانا چاہیے ۔آنٹی نے ان سب کو آتا دیکھ کر انکل کو دوسرے روم میں بجھوا دیا تا کہ وہ کسی بات میں کوئی مداخلت کریں ،نہ رائے دیں۔

جن گھروں میں فیصلوں کا حق عورتوں کو دیا جاتا ہے ،وہ پھر اسی طرح سے اُجاڑ بچھاڑ کرتی ہیں اور جہاں مردوں کی اتنی عزت ہو کہ فیصلوں کے وقت انھیں کمرے سے نکال دیا جائے تو وہاں انصاف کی کیا توقع کی جائے؟

وہ سب اندر جا کے بیٹھے، تو آنٹی کی حقارت بھری نظروں کا نشانہ ادیوا مسلسل بنتی رہی۔

اشعر نے انکل کو بلانے کا کہا، تو وہ قدرے غصیلے لہجے میں بولی۔

"مجھ سے کریں، آپ نے جو بھی باتیں کرنی ہیں۔"

مسز عمر اور اشعر ان کے رویے سے بہت حیران ہوئے۔ادیوا تو خیر یہ سب رنگ دیکھ چکی تھی ،اس لیے اس کے لیے کوئی خاص حیرت کی بات نہ تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بات کرتے۔آنٹی نے خود ہی بہت غیر

متوقع طریقے سے بات شروع کردی۔

"آپ اسے لے جائیں۔ ہمارے گھر میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

اولیا پہ تو جیسے کوئی ناگہانی آفت نازل ہوگئی ہو، کوئی آسمانی بجلی اور وہ وہیں جل کے راکھ ہوگئی ہو۔۔ان کا یہ کہنا تھا کہ اشعر نے فوراً پوچھا۔

"آنٹی! میری بہن نے قصور کیا کیا ہے۔۔آخر اسے کیسے آپ نے اتنی بڑی بات کہہ دی؟"

"ایک تو یہ ضرورت سے زیادہ معصوم اور امیچور ہے۔ ہمارا گزارا نہیں اس کے ساتھ اور دوسرا ایسی سینسٹو لڑکی کو ہم اپنے گھر میں رکھ کر جان کا وبال نہیں بنا سکتے۔"

"کل تک تو میری معصومیت' میری امیچورٹی کو اس گھر میں میری شخصیت کا مضبوط پہلو سمجھا جاتا تھا آنٹی! اور آج یہی میرے لیے طعنہ بنا کے آپ میرے منہ پر مار رہی ہیں۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ یہ میرے صفان کا گھر ہے۔"

اولیا روتے روتے اپنی آواز کا ٹھہراؤ برقرار نہ رکھ پائی۔

اشعر اور مسز عمر اس کی حالت دیکھ کر ٹوٹ کر رہ گئے۔اب مسز عمر اور اشعر ضرورت سے زیادہ نرم لہجے میں استفسار کرنے لگے، مگر صفان کی والدہ

نے ایک بھی بات تحمل مزاجی سے نہ کی۔ادیوا سے نہ رہا گیا، تو وہ انکل کو ڈھونڈتی ہوئی باہر کمرے تک آئی، مگر وہ بھی ادیوا کے حق میں فرعون سے کم ظالم ثابت نہ ہوئے۔ادیوا کسی صورت گھر سے جانے کو تیار نہ تھی۔

جن گھروں کی بنیادوں کو اپنے خون سے سینچا ہو ناں! تو پھر وہاں سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔آخر کار فون پر صفان کی بات ادیوا سے کرائی گئی اور اس نے ادیوا کو کہا۔

"تم گھر جاؤ میں وہاں آ کر بات کرتا ہوں۔"

اس آس پر وہ واپس آ گئی، کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے صفان علی ادیوا کو کبھی اپنی زندگی سے بے دخل نہیں کر سکتا اور اس کے رابطہ نہ کرنے کی وجہ صرف اس کی ناراضگی ہے وہ بھی وقتی طور پر۔وہ ٹھیک ہو جائے گا ......سب پہلے جیسا ہو جائے گا......ادیوا کے بھرم تھے کہ ٹوٹنے کا نام نہ لیتے ......

امیدوں کا بھی کوئی دین ایمان نہیں ہوتا۔ایک دم سے بنتی ہیں اور ٹوٹتی ہیں ان کو جتنا بھی مضبوط کر لو،ان کی قسمت میں آخر کار ٹوٹنا ہی لکھا ہوتا ہے۔چاہے انسان فلک سے چاند توڑ کے رشتوں کی مانگ بھر دے یا چاہے قدموں میں کائنات ڈال دے، جنھیں توڑ کے جانا ہو، وہ دل سے بندھی گرہوں کا بھی لحاظ نہیں رکھتے۔جسم سے روح سمیت سب کھینچ کے لے

جاتے ہیں اور پیچھے رہنے والے خالی آنکھیں لیے امیدوں کی قبروں پہ بین کرتے رہ جاتے ہیں ......بس اور ادیوا بے بسی کی انتہا پہ تھی۔

وہ سب واپس آ گئے۔اب ادیوا شدت سے صفان علی کا انتظار کرنے لگی۔کچھ ہی دیر بعد گھنٹی بجی اور صفان علی کوریڈور سے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا۔عمر حیات نے اسے ویلکم کہا،کیوں کہ گھر کے باقی لوگ تو اسے دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے،جو سلوک اس نے کیا اور کر رہا تھا ادیوا کے ساتھ،اس کے بعد وہ اسی سلوک کا مستحق تھا۔

رسمی سلام دعا کے بعد صفان علی ادیوا کے کمرے میں چلا گیا اور ادیوا وہاں پہلے سے ہی اس کی منتظر تھی۔بھاگ کر اس کے گلے لگنا چاہا،تو صفان علی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے وہیں روک دیا۔انسان میں ظرف ہو تو ہی معاف کر سکتا ہے۔ایک بات تو واضح تھی،ادیوا جتنا ظرف صفان علی کی فطرت میں تھا ہی نہیں...... ورنہ جو تکلیفیں،جو اذیتیں اس نے اپنے لہجے سے،لفظوں سے اسے نوازی تھیں ان کا تو حساب کتاب بھی نہ کیا تھا ادیوا نے...... اگر وہ اپنے حساب کھول لیتی،تو صفان علی کو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا حق بھی نہ دیا جاتا۔ادیوا کے بیان سے ہی اس کو سزا سنا دی جاتی،لیکن بات ادیوا کے ظرف کی تھی،جو اس کے رکنے کے اشارے پر سہم گئی تھی،کیوں کہ ادیوا جانتی تھی کہ وہ تذلیل کرنے میں کوئی لحاظ نہیں کرتا اور ادیوا ایک بار پھر

سے اس کے ہاتھوں نہیں ٹوٹنا چاہتی تھی۔

"اودیوا! ہماری شادی کو کتنے مہینے ہو چکے ہیں۔ تین سے زیادہ ہو چکے ہیں ناں؟ تمھیں نہیں لگتا کہ ہماری انڈرسٹینڈنگ نہیں ہو پا رہی۔ تم میرے ساتھ خوش نہیں، اسی لیے تم نے اپنی جان لینے کی کوشش کی۔"

وہ اپنے سارے رویوں سے یکسر انجان ہو کے اودیوا کو الزام دیتا گیا۔ ہر قصور کی سزاوار اودیوا ٹھہری۔

بدگمانی کی ساری حدیں ٹوٹتی گئیں، جوں جوں وہ بولتا گیا۔

"میں نے اب اپنے اور تمھارے بھلے کے لیے یہی فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں اس رشتے کا بوجھ نہیں اٹھانا چاہیے، کیوں کہ ہم دونوں میں ہی اتنی طاقت نہیں ہے۔"

اس کا دل چاہا کہ اسی وقت اٹھے اور صفان علی کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دے اور اسے پیار سے سمجھائے کہ وہ بدگمان ہے، بہت بدگمان ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی صفان علی اپنی بات مکمل کر کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ عجیب بے چینی کا شکار تھی۔ بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے گئی اور ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔

"صفان! میں آپ کو ایک بات بس ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ پلیز! میری بات سن لیں۔"

اب ادیوا کی بے بسی انتہا پہ تھی۔

صفان علی نے اسے موقع دیا اور وہ بولی۔

"صفان! آپ کو مجھ سے شکایت ہے ناں کہ میں نے وین کیوں کاٹی؟ تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ جب آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمھیں صبح تمھارے گھر چھوڑ آؤں گا۔صفان! آپ کو پتا ہے کہ ادیوا صفان موت برداشت کر سکتی ہے، لیکن صفان علی سے الگ ہونا نہیں۔اگر آپ میری وہ غلطی معاف کر دیں، تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ مجھے جیسے رکھیں گے، جہاں رکھیں گے، رہوں گی ......کبھی کوئی گلا بھی نہیں کروں گی ......"

اس کے آگے اس وقت ادیوا کسی بھکاری کی طرح محتاج کھڑی تھی

-

یہی فرق ہوتا ہے ایک انسان سے محبت میں اور اللہ سے محبت میں۔

انسان عمر بھر کے گناہ لے کر اللہ کے سامنے ندامت کا ایک آنسو بہاتا ہے اور وہ اس کے وجود کی ساری کرچیوں کو یکجا کر کے اس کی تکمیل کر دیتا ہے۔جب کہ ایک انسان ایک ایسی خطاء بھی معاف نہیں کرتا جس کی وجہ خود اس کا اپنا رویہ ہوتا ہے۔

اب وہ ہاتھ جوڑ کے صفان علی کے سامنے کھڑی تھی، ایک بات تو طے تھی کہ ادیوا دل ہی دل میں اپنی غلطی پر بہت شرمندہ تھی۔اسے احساس تھا

اس نے واقعہ ہی اپنے اللہ کو بھی ناراض کیا اور اپنوں کو بھی دکھی کیا، لیکن جن حالات سے وہ گزری، اس نے وہی کیا، جو وہ کر پائی۔

"صفان! مجھے معاف کر دیں۔ اللہ بھی تو ہے نا! ہماری چھوٹی بڑی سب غلطیاں معاف کر دیتا ہے، آپ میری آخری غلطی سمجھ کے معاف کر دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ سے جڑے ہر انسان کی ایسے ہی عزت کروں گی، جسے میں آپ کو دیتی ہوں۔"

اور ادیبا جانتی تھی کہ اس نے ہمیشہ سب کو سر آنکھوں پہ رکھا تھا۔

"اب اس سے زیادہ میں اور کیا کہوں صفان! کہ آپ کو مجھ پر یقین آئے اور آپ اسی حق سے مجھے گھر لے جائیں، جس طرح پہلی بار لے کر گئے تھے۔ ہاتھ پکڑ کر، محبت سے، مان سے۔"

ابھی وہ اپنی بات ختم کر بھی نہ پائی تھی کہ صفان علی اٹھ کر تیزی سے باہر چلا گیا۔

انسانوں میں کہاں اتنا ظرف کہ وہ کسی کی غلطی معاف کر سکیں۔ وہ تو بس ایک چھوٹی سی خطاء کے منتظر ہوتے ہیں، ادھر غلطی ہوئی اور ادھر سزا آپ کا مقدر بنا دی گئی۔ آپ کی ساری محبتیں، ساری قربانیاں خاک میں ملا دی جاتی ہیں۔ آپ کے وجود سمیت۔

ادیبا تیزی سے اس کے پیچھے بھاگی، تو حادی نے اس کا ہاتھ پکڑ

لیا۔

"ادیوا! سنبھالو خود کو...... مجھے مجبور مت کرو...... میں اس انسان سے وہ سلوک کروں، جو تم برداشت نہ کرسکو۔ کبھی سوچا ہے ادیوا! کس تکلیف سے گزر رہے ہیں ہم سب؟ مانا کہ تمھاری محبت کے معاملے میں ہمارے وجود بے وقعت ہیں۔ صفان علی کے اونچے مرتبے کے آگے ہم سب تمھیں دکھائی نہیں دے رہے، لیکن ہمارے وجود کو اتنا بھی مت نظر انداز کرو ادیوا! کہ کل کو تمھیں ہماری ضرورت پڑے اور تمھیں ہمارے مردہ وجود مٹی کے ڈھیلوں سے نکالنے پڑیں اور پھر ہم تمھارے کچھ کام نہ آسکیں......"

حاوی کی آنکھیں بھیگتی جا رہی تھیں اور وہ اپنی بات مکمل کیے بنا ہی وہاں سے چلا گیا۔

وہ بوجھل قدموں سے کمرے میں واپس آ گئی۔ جانے کتنی دیر تک روتی رہی۔ اس بات کو پانچ دن گزرے تھے کہ عمر حیات اور مسز عمر ادیوا کے پاس آئے۔ وہ اپنے کمرے میں کچھ بکس کو ترتیب سے شیلف میں لگا رہی تھی۔

"پاپا...... ماما! آئیں ناں بیٹھیں...... کیا ہوا آپ لوگ مجھے بلا لیتے۔"

"نہیں بیٹا! کوئی خاص کام نہیں تھا۔ بس سوچا تم سے پوچھیں کہ کیا

پلان ہے آ گئے ...... فارغ ہوا اور فارغ ذہن میں الٹی سیدھی سوچوں کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ تم کیلیفورنیا چلی جاؤ اور آؤٹنگ بھی ہو جائے گی۔ تمہارا شوق بھی ہے ایسی جگہیں دیکھنے کا۔"

"واؤ پاپا! گریٹ آئیڈیا ......لیکن صفان ...... ؟ پاپا! آپ صفان سے بات کریں گے، تو وہ مان جائیں گے ناں! اور ہم دونوں کو کچھ بریک بھی مل جائے گی۔"

اب عمر حیات ہمت کر کے بھی وہاں زیادہ دیر نہ بیٹھ سکے۔ دونوں پریشان سے دکھائی دے رہے تھے۔ اودیا کے اس جواب کے بعد دونوں چپ سے باہر نکل آئے اور وہ بیڈ پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ اپنا اور صفان کا ساتھ...... کیلیفورنیا کی خوبصورت گریزی میں حسین لمحے ہوں گے اور وہ کافی دیر خود سے باتیں کرتی رہی۔ آج ڈائننگ ٹیبل پر کوئی موجود نہ تھا۔ جب اودیا ڈنر کے لیے نیچے آئی، تو سب لوگ لاؤنج میں افسردہ، پریشان حال بیٹھے۔ اودیا سمجھ نہ پا رہی تھی کہ آخر ہوا کیا ہے۔ اس کے بہت اصرار پر سب نے تھوڑا بہت کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

شاید پریشانیاں اور دکھ بانٹنے کے لیے اپنے کمرے کی دیواروں سے اچھا اور سچا ساتھی کوئی نہیں ہوتا۔ وہ آپ کو ہر ہر کروٹ ٹوٹتے بکھرتے زندگی سے لڑتے دیکھتی ہیں۔ آپ کے سارے راز اپنے اندر جمع کرتی رہتی

ہیں۔

ٹھیک اگلے دن ایک پلوڈر آ کر عمر حیات کے دروازے کے آگے رکا،تو ادیوا بے اختیار اپنے کمرے کی بالکونی پر آ گئی۔اب ڈرائیور اور داچ مین مل کر اس گاڑی سے سامان اتارنے لگے۔ادیوا کے قدموں سے جیسے زمین نکل گئی یہ تو وہی سامان تھا۔ اس کے کمرے کا۔۔اس کا بیڈ اور ڈریننگ۔۔وہ ننگے پاؤں کار پورچ کی طرف بھاگی۔

"ماما......ماما! یہ کیا ہے۔پلیز کہاں ہیں۔جلدی آئیں۔"

جیسے کوئی درد کی extreme سے چلا رہا ہو،مگر آواز پھر بھی اتنی دھیمی ہو کہ اپنے آپ کو بھی سنائی نہ دے۔

ادیوا چلا چلا کر پوچھ رہی تھی۔

" کیوں لائے ہیں آپ لوگ یہ...... کس سے پوچھ کے میرے کمرے سے سامان اٹھایا ہے۔"

وہ اب واقعی اپنے حواس کھو رہی تھی۔

اتنے میں مسز عمر تیزی سے باہر آئیں۔پیچھے ہی عمر حیات اور حادی باہر آ گئے۔مسز عمر نے سامان سٹور روم میں رکھنے کی ہدایت کی اور وہ لوگ ادیوا کو اندر کمرے میں لے آئے۔

"بابا! پلیز ......فون کریں صفان کو......اسے پتا بھی نہیں ہو گا کہ یہ

ہمارے کمرے کا سامان اس طرح ...... حادی! پلیز ......تم کال کرو۔ کوئی توفون کرو اس کو۔"

سب سر جھکائے کھڑے تھے اور مسز عمر بار بار اسے گلے لگا کر دلاسے دے رہی تھیں۔

"ماما......! پلیز ......آپ پوچھیں ناں۔"

"او کے! کوئی مت کرے ...... میں خود صفان کو فون کرتی ہوں۔"

اور وہ اپنے کمرے سے فون اٹھانے کے لیے بھاگی کہ اچانک اس کا ہاتھ حادی نے پکڑ لیا۔

"نہیں ادیوا! اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ بہن کو گلے لگاتا رہا اور آنسو روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

"کیا مطلب ......کیا مطلب حادی! ضرورت نہیں ہے۔ یہ سامان آنٹی نے بھیجا ہوگا۔ مجھے پتا ہے کہ صفان کو تو پتا بھی نہیں ہوگا میں اس کو بتا کر آتی ہوں۔"

"ادیوا! پلیز ...... سمجھنے کی کوشش کرو۔ حقیقت کو تسلیم جتنی جلدی کرلیا جائے، اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔"

"پاپا! کون سی حقیقت؟ آپ لوگ کیا بات کر رہے ہیں۔ کیا ہوا ہے؟"

"ماما! پلیز......آپ مجھے بتائیں کیا ہے یہ سب؟"

ہزار طرح کے وہم اس کے دل میں آنے لگے۔ کبھی وہ ایک وسوسے تو کبھی دوسرے سے ڈرتی۔

"ادیبا! صفان تمھیں طلاق بھجوا چکا ہے۔"

اسے لگا اس پر آسمان گر پڑا ہے اور وہ زمین میں کئی سو فٹ دھنس گئی ہے۔

"واٹ...... ماما! پلیز...... کہہ دیں...... پلیز! کہہ دیں آپ کہ یہ جھوٹ ہے...... آپ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ اپنے حق کا استعمال اتنا غلط نہیں کرسکتا۔ ماما! وہ اپنی مرضی سے اپنے فیصلے سے مجھے خود سے الگ نہیں کرسکتا...... میری ایک غلطی...... ماما! بس ایک غلطی پہ میری پوری زندگی جہنم نہیں بنا سکتا......وہ......"

وہ بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی اور لاک کرلیا۔

پاگلوں کی طرح چیزیں اِدھر اُدھر پھینک کر موبائل ڈھونڈنے لگی۔ باہر سب زور زور سے دروازہ بجانے لگے۔

ادیبا......ادیبا! خدا کا واسطہ......دروازہ کھولو بیٹا!"

پتا نہیں کون کون کیا کیا کہہ رہا تھا۔

ادیبا نے کانپتے ہاتھوں سے صفان کا نمبر ملایا اور اس کے فون

اٹھاتے ہی ادیبا بولتی چلی گی۔

"صفان! میرا قصور بتاؤ؟؟ کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا؟ جب یہ رشتہ ہم دونوں کی مرضی سے جڑا تھا تو ختم صرف تمھارے دستخط سے کیسے ہو سکتا ہے؟ بتاؤ نا! میرا ایک بھی قصور بتاؤ؟"

اگر رونے سے کوئی مرتا تو آج ادیبا کا آخری دن ہوتا، وہ چیخ چیخ کر روئی۔

"بولو صفان علی! بولو کس چیز کی سزا دی ہے...... محبت کرنے کی؟ تمھارے ہر فیصلے کے آگے سر جھکانے کی؟ کتنا مان تھا مجھے تم پر...... امیدیں تو اسی دن توڑ دی تھیں جب تم نے میری میرے قصور کے بغیر اپنے گھر والوں کی خوشی کے لیے تذلیل کی تھی۔ جب تم مجھے گالیاں دیتے ہوئے چھت سے گھسیٹ کر کمرے میں پھینک رہے تھے۔ روح تو میری اسی دن کھینچ لی تھی تم نے میرے وجود سے...... مر تو میں اسی دن گئی تھی۔ دیکھو! میرا ظرف کہ پھر بھی تم سے محبت میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ تمھیں محسوس نہیں ہونے دیا کبھی...... اور تم میری ذرا سی غلطی کے بدلے مجھے اپنی زندگی سے اٹھا کر باہر پھینک گئے۔ واہ صفان علی! واہ...... کس بات کا ڈر تھا تمھیں...... مرد تو بہادر ہوتے ہیں...... تم کیوں اتنے بزدل نکلے......؟ کیا محبت نبھائی ہے؟ اس سے تو بہتر تھا تم میرے خیالوں میں ہی رہتے، میں وہیں تمھیں پوج لیتی۔ تمھاری

حقیقت اتنی بھیانک ہوگی، میں نہیں جانتی تھی۔"

وہ روتی چلی گئی......

"صفان! بہادر...... یہ بہادری تھی تمہاری کہ ایک بے بس لڑکی کی زندگی اس کی مرضی کے بغیر اس طرح اجاڑ دی تم نے۔ تمہارے لیے یہ لفظ بہت چھوٹا ہوگا، مگر یہی لفظ اگر تمہاری بہن کو اس کا شوہر سنائے، تو تمھیں تب احساس ہوگا...... تب ڈرو گے تم اللہ سے۔ تب تکلیف ہوگی تمھیں۔"

وہ چیخ چیخ کر روتی گئی اور بولتی گئی۔

"میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کبھی بھی نہیں...... تم ہوتے کون ہو میری غلطی پر مجھے سزا سنانے والے؟ جو بھی اذیت دی تھی میں نے ...... خود کو دی تھی۔ تمہارے سلوک کا بدلہ بھی اپنی ذات سے لیا تھا...... کس لیے برا لگا تمھیں؟"

اتنے میں حادی نے زور دار دھکے سے دروازہ کھولا اور ادیبا دھاڑیں مار مار کر روتی رہی۔ اپنے کمرے کی چیزیں شیلفس سے پھینکتی رہی۔

"ماما! پوچھیں اس انسان سے ...... کیوں کیا اس نے میرے ساتھ ایسا۔"

سب اسے پکڑتے۔ دلاسے دیتے اور وہ بگڑتی چلی گئی۔

"ماما! میں اس کے پاؤں پکڑ لیتی۔ ماما! میں اس کی ماں کو اللہ کا

واسطہ دیتی، تو وہ مان جاتی ناں! ماما! میں ان سب لوگوں کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لیتی۔ وہ مجھے کبھی نہ چھوڑتا...... وہ مجھے ایک بار کہتا تو سہی...... ماما! وہ مجھے کبھی نہ چھوڑتا۔ اللہ نے سارا اختیار مرد کو کیوں دے دیا...... ماما! میری مرضی کے بغیر...... مجھ سے پوچھے بغیر...... مجھے پتا بھی نہیں کہ میں اس کی زندگی سے نکل بھی گئی۔ یہ کیسا رشتہ ہے ماما! آپ تو کہتی تھیں کہ میاں بیوی کا رشتہ بہت مضبوط رشتہ ہوتا ہے۔ یہ تو ریت کا محل نکلا ماما! صفان علی نے اپنے کھیلنے کے لیے بنایا اور دل بھر گیا، تو توڑ کر چلا گیا۔ ماما! وہ میرا گھر توڑ کر چلا گیا...... ماما! وہ چلا گیا۔"

ادیبا بات کرتے کرتے بے ہوش ہو کر گر گئی۔

"ہوش کر میری بچی۔" مسز عمر روتے ہوئے چلائی۔

"عمر...... عمر! دیکھیں میری بچی کو کیا ہو گیا ہے۔"

عمر حیات پہلے ہی دروازے سے لگے بیٹھے تھے۔

"حادی! ڈاکٹر کو بلاؤ جلدی......"

"ماما! اگر ادیبا کو کچھ ہوا، تو میں اس بے غیرت انسان کو اپنے ہاتھ سے گولی مار کے آؤں گا۔" حادی آنسو پونچھتے ہوئے غصے سے بولتا ہوا باہر چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر نے ادیبا کو نیند کے انجکشن دے دیے۔

"nervous break down ہونے کی وجہ سے اسے مکمل نیند کی ضرورت ہے۔ کوئی ایسی بات نہ کی جائے۔ جو اسے پریشان کرے۔"

ڈاکٹر ہدایت کر کے چلا گیا۔ کچھ دن تک ادیوا ۱۵ سے ۱۸ گھنٹے سوتی رہی۔ جس ٹائم ہوش میں آتی ـــ خاموشی سے چھت کو گھورتی رہی۔ نہ کوئی الفاظ تھے اور نہ کوئی ایسے دکھ تھے، جو بیان ہوتے تو گھٹ جاتے یا بٹ جاتے۔

سارے کشکول خالی کے خالی رہ گئے۔ نہ ہمدردی کے سکے ملے نہ ترس کی امداد ہوئی۔ ظلم بے شمار تھا جو وافر مقدار میں جھولی میں ڈال دیا گیا تھا اور وہ باقی کی زندگی گزارنے کے لیے بہت تھا۔

ادیوا صفان پھر سے ادیوا عمر ہو چکی تھی۔ اس خودغرض انسان نے نام بھی دے کر چھین لیا تھا۔

لڑکیاں بھی کتنی پاگل ہوتی ہیں ناں! کاغذ پر جڑے رشتے کی بنیاد پر باپ کا نام ہی اپنے نام سے الگ کر دیتی ہیں۔ گھر چھوڑ جاتی ہیں، وہ گھر جس میں پلتی بڑھتی ہیں اور باپ کی شفقت، تو دیکھیں کہ بیٹی کے ناکام لوٹ آنے پر گھر کے دروازے بند نہیں کرتا ...... کوئی طعنہ ...... کوئی طنز کیے بغیر پھر سے اپنا نام اس کے نام کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔

اس بات کو پندرہ دن گزر چکے تھے۔ ایک دن مسز عمر ادیوا کے

کمرے میں آئی۔ وہ ویسے ہی بے سدھ لیٹی ہوئی دیواروں کو گھور رہی تھی۔

صاف ظاہر تھا کہ سوچ کہیں اور ہے۔

"ادیوا...... بیٹا! وہ میں سوچ رہی تھی کہ ہم کچھ عرصہ کے لیے کراچی

چلتے ہیں...... تمھارے فیصل ماموں کے پاس۔ کیا خیال ہے تمھارا؟"

"ماما! کیا میں وہ پیپرز دیکھ سکتی ہوں، جو صفان علی نے بھیجے تھے۔"

اس نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

مسز عمر کا دل مٹھی میں آ گیا۔ ایک دم سے اور وہ اٹھ کے چلی گئیں۔

"ادیوا! یہ ہیں وہ پیپرز۔" اُنھوں نے ایک لفافہ ادیوا کی طرف

بڑھاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی ایک پلاسٹک بیگ تھما دیا۔ جس میں ادیوا کی

تصویروں کے بے شمار ٹکڑے موجود تھے۔ ادیوا انھیں دیکھتی گئی اور اذیت کے

گھونٹ بھرتی گئی۔

پھر ادیوا نے لفافہ کھولا اور پہلی نظر صفان علی کے دستخط پر پڑی......

کس شان سے اُس نے اپنے signature کیے ہوئے تھے......

"واہ...... صفان علی...... !!!!!"

ادیوا نے پھر طلاق کی وجہ پڑھنا شروع کی، جیسے جیسے پڑھتی گئی

، اسے اپنا وجود کسی گہری کھائی میں گرتا محسوس ہوتا گیا...... پہلی لائن میں ہی

ذہنی توازن میں خلل لکھا گیا تھا اور آگے وہی immaturity اور اسی طرح

کی چار، پانچ اور لائینز، جن کو پڑھے بغیر ہی ادیوا نے کاغذ فولڈ کیا اور لفافے سمیت پاس پڑی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"واقعی ہی صفان علی! تم سے محبت کرنا میرا دماغی خلل ہی تو تھا...... کوئی عقل والی لڑکی کبھی نہ ایسا قدم اُٹھاتی......"

اب وہ خود سے باتیں کرنے لگی دل ہی دل میں تڑپتی رہی۔

"ماما! آپ سے ایک بات پوچھوں؟ میری مرضی کے بغیر طلاق کیسے جائز ہو سکتی ہے؟ پتا نہیں ماما! میرا دل نہیں مانتا اتنا بڑا رشتہ یکطرفہ کیسے ختم ہو سکتا ہے؟"

مسز عمر جانتی تھیں کہ لوکل کنٹونمنٹ آفس سے اُس کے لیے letter ضرور آئے گا، تین ماہ کے اندر وہ چاہے، تو صفان علی کی طلاق مسترد کر سکتی ہے، لیکن وہ کبھی نہیں چاہتی تھیں کہ اُن کی بیٹی کسی زبردستی کے رشتے کو عمر بھر کے لیے اپنے گلے کا ہار بنا لے اور ہر روز اذیت سہے۔ وہ چپ ہو گئیں...... بالکل چپ۔

اب اُسے یہی سوال اُس انسان سے کرنا تھا، جو اس کا جواب دے سکے اور وہ تھا صفان علی......

ادیوا نے شام ہوتے ہی صفان علی کو فون کیا......

"صفان! میرا دل تسلیم نہیں کر رہا ابھی بھی مجھے لگتا ہے کہ میرا رشتہ تم

سے ختم نہیں ہوا، مجھ پر ابھی بھی صرف تمھارا حق ہے ...... میں ابھی بھی صرف تمھاری ہوں۔"

"ادیوا! میں تمھیں طلاق دے چکا ہوں ...... میں نامحرم ہوں تمھارے لیے...... نہ میرا تم پر کوئی حق ہے اور نہ تمھارا مجھ پر......"

"صفان ! میرا گناہ کیا تھا؟" ادیوا کی آواز بھر آئی۔ "مجھ پر کوئی الزام، کوئی تہمت کچھ تو لگاتے، کوئی جرم تو ثابت کرتے میرا......اس سے تو بہتر تھا صفان! تم میرا ہاتھ پکڑ کر ریل کی پٹری پر کھڑا کر دیتے۔ ایک ہی دفعہ میں میری جان نکل جاتی......اب جو ہر ہر لمحہ میری روح قبض ہوتی ہے، یہ اذیت میں کیسے برداشت کروں؟"

"وقت ہر زخم بھر دیتا ہے۔ ادیوا! move on ۔ دیکھو! زندگی بہت خوبصورت لگے گی تمھیں......"

"move on؟ تمھارے بغیر......؟ مجھے لگتا ہے جیسے تم نے ہاتھ چھڑا کر میری بینائی چھین کے مجھے دنیا کی بھیڑ میں اکیلا کھڑا کر دیا ہے...... مجھے ٹھوکریں لگیں گی...... میں گروں گی، ٹوٹ جاؤں گی، تو کیا اُس وقت تم اپنے لیے میرے منہ سے دعاؤں کی اُمید رکھتے ہو؟ کیا اب ہر دفعہ ظرف اور ضبط میرا ہی آزمایا جائے گا؟ میں تمھیں معاف نہیں کر سکتی ......کبھی بھی نہیں ...... یہ بات یاد رکھنا......اللہ کی عدالت میں تم میرے سب سے

بڑے گناہ گار ہو گئے...... میں اپنی ایک ایک ٹھوکر ایک ایک تکلیف کو اللہ کے دربار میں رکھتی جاؤں گی...... اور پھر میں بھی تم سے اسی طرح کہوں گی "move on safan...

صفان علی کا دل ایک دم سے اتنا زور سے دھڑکا کہ اُسے لگا سینہ پھاڑ کر باہر آ جائے گا۔

انسان جتنا بھی پریکٹیکل اپروچ رکھتا ہو احساسِ گناہ میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ اُسے اپنے ہی قدموں پر منہ کے بل گرا دے اور انسان پھر نہ اُٹھ سکتا ہے نہ مزید جھک سکتا ہے...... کسی لاش کے بوسیدہ ڈھانچے کی طرح زمین میں گڑا رہتا ہے......

صفان علی کے اندر اب بغاوت کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ضمیر سے لڑنے کے عمل سے گزر رہا تھا۔ ایک Guilt تھا، جو اُسے اندر ہی اندر کھانے لگا تھا۔ اب اُس کو ادیبا سے معافی درکار تھی اور اُس کے لیے وہ ادیبا کو واپس اُسی stage پر لانا چاہتا تھا کہ وہ اپنے دل سے اسے معاف کر دے، لیکن اس کے لیے ادیبا کے دل میں اپنی ڈوبتی محبت کو پھر سے اُبھارنا تھا۔

انسان اپنا ایک گناہ چھپانے کے لیے دوسرا کرتے ہوئے ذرا نہیں ڈرتا۔ کتنا گر جاتا ہے نا!! اپنے پچھتاوں کا بوجھ اُسی انسان پر لاد دیتا ہے، جو

پہلے سے ہی اُس کے ظلم کے بوجھ تلے مر رہا ہوتا ہے۔

ادیوا ابھی اُس سے زیادہ دُور نہ جا پائی تھی اور یہ بات وہ جانتا تھا۔ اُسے واپس لانا اور اپنے کیے کی معافی طلب کرنا، صفان علی کے لیے کوئی بڑا مسئلہ تھا ہی نہیں۔ وہ دو بول پیار کے بولتا، تو ادیوا موم کی طرح پگھل جاتی ......

ادیوا پر رحم اُسے تب بھی نہیں تھا اور اب بھی نہیں آیا تھا...... ابھی بھی وہ انسان بس اپنی ذات کے سکون کا متلاشی تھا...... بھلے اس کے بدلے میں ادیوا کی زندگی کانٹوں سے بھر جاتی یا اس کی روح تار تار بکھر جاتی ......صفان علی کے پاس رحم نہیں تھا۔

"ادیوا! تم مجھ سے محبت کرتی ہو نا! تو خدا کے واسطے میرا یقین کرو، ہمیں نظر لگ گئی ہے ہم پر جادو کیا ہو گا کسی نے ...... میں تمھیں یقین دلا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں آج بھی تم سے ویسی ہی محبت کرتا ہوں۔ جیسی میں پہلے کرتا تھا ......تم میرا پہلا پیار ہو ادیوا...... تمھاری جگہ کبھی کوئی نہیں لے سکتا۔ چاہے میری شادی ہو جائے ...... بچے ہو جائیں۔ تمھاری کمی مجھے کبھی سکون نہیں لینے دے گی ادیوا! میری ہر خوشی ادھوری ہے تمھارے بعد ......"

یہ سب باتیں وہ چار ماہ بعد کر رہا تھا۔ شاید اندر کے پچھتاوے نے مزید نظر انداز نہ کرنے دیا ہو، جو سلوک اُس نے ادیوا عمر کے ساتھ کیا

تھا.....ایک غلطی کے بدلے عمر بھر کی سزا سنادی گئی تھی اسے اور غلطی بھی وہ، جس کی وجہ ان سب کے روپے تھے۔

لیکن محبت سچی ہو تو دل توڑ کے جانے والے کی راہ ہمیشہ دیکھتی رہتی ہے نہ اپنے دروازے بند کرتی ہے اُس پہ..... نہ اُس کو انکار کی تکلیف سے گزار سکتی ہے.....

ادیوا کے دل میں صفان کی محبت جاگنے کا موقع تو تب آتا، جب وہ اس محبت کو دل سے نکال چکی ہوتی.....وہ تو وہیں تھی.....

صفان کی محبت کا آسیب اُس کے دل کو آسیب زدہ کر چکا تھا اور آسیب زدہ جگہیں اتنی آسانی سے اپنے اثرات سے خالی نہیں ہوتیں۔

ادیوا کی محبت اتنی پاکیزہ اور بے لوث تھی کہ بے نام رشتے کے ساتھ بھی وہ نبھا کرنے کا ظرف رکھتی تھی۔

صفان علی ہر دن کے اختتام پر ادیوا سے بات کرتا۔ وہ لوگ کبھی نہیں ملے تھے کیوں کہ جب رشتے اپنی پہچان کھو دیتے ہیں، تو چہروں کی مانوسیت بھی اجنبی لگنے لگتی ہے.....وہ صفان علی کے چہرے کو دیکھنے کی اب خواہش مند تھی بھی نہیں۔

کچھ ہی دن بعد فردوس ماموں کی شادی تھی اور صفان اپنے ماموں کی شادی کی تیاریوں میں بزی رہا۔ کبھی وہ ادیوا سے بات کر پاتا اور کبھی نہیں

اور جب بھی نہ کر پاتا، تو ادیوا گھنٹوں اس کے اُسی تصوراتی پیکر سے باتیں کرتی رہتی۔

"صفان! تم نے تو صرف دُکھ کو، خوشی کو محسوس کیا ہو گا۔ میں نے تو ان جذبوں کی تخلیق کا عمل بھی دیکھا ہے...... میں نے تو محبت کو روح میں ڈھلتے اور خون میں تحلیل ہوتے بھی دیکھا ہے۔ جس عمل سے گزر کر روح جسم سے جدا ہوتی ہے...... میں نے تمہاری جدائی میں ہر روز روح کو اس کرب سے گزرتے دیکھا ہے۔ کون کہتا ہے...... فراموشی ممکن ہے۔ میں نے تو خود کو تمہاری یاد میں پاگل ہوتے دیکھا ہے۔ شاید صفان! تم نے کوئی انتہا پسند نہیں دیکھا ورنہ تم میری حالت سے ضرور واقف ہوتے......"

کبھی وہ اس سے گلے کرتی...... دل ہی دل میں روٹھ جاتی۔

"صفان! تم میرے گروی رکھے خواب لوٹا دو...... اب تو میں نے تمہارا قرض سود سمیت چکایا ہے۔ جس محبت کو تم سے قرض لے کر میں نے اپنے دل میں غنچے کھلائے تھے، وہ غنچے اب بیابان جنگل بن چکے ہیں...... تمہارا قرض ادا ہو چکا ہے...... مجھے میرے خواب لے جانے کی اجازت دے دو...... ادیوا عمر ٹوٹ گئی صفان علی!"

وہ کئی کئی گھنٹے یوں ہی خود سے باتیں کرتی رہتی...... بے مقصد باتیں ......

مگر اودیبا کا یقین پختہ سے پختہ ہوتا چلا گیا کہ صفان علی ابھی بھی اُسی کا ہے، اُن کا رشتہ نہیں ٹوٹا اور اس میں قصور جتنا صفان علی کا تھا اتنا ہی اودیبا کا اور سب سے بڑی وجہ ایمان کی کمزوری تھی۔ جب اللہ کے فیصلوں کو ہم اپنے فیصلوں سے بدلتے ہیں نا! تو نہ دنیا کے قائل رہتے ہیں اور نہ آخرت کے...... پھر انسان ایسے ہی بھٹکتا ہے سرابوں کے پیچھے......اس کی روح ایسے ہی پُل صراط پر لٹکی ہوتی ہے۔

اُن کے اس رابطے کو پورے ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور اودیبا کے گھر والے اس بات سے بالکل لاعلم تھے۔ اودیبا اب سب میں گھل مل کر رہتی، مگر ضرورت سے زیادہ بدل چکی تھی۔ اب اس کی ہنسی سے گھر نہیں گونجتا تھا۔ اب وہ اشعر اور حادی سے اپنی ضدیں نہیں منواتی تھی۔ اب وہ عمر حیات اور مسز عمر سے فرمائشیں نہیں کرتی تھی۔ انسان میں بدلاؤ تو آ ہی جاتا ہے اور وہ بھی خاص کر اُس طوفان کے بعد جو آپ کو بے سروسامان کر جائے۔ جب صرف سر کے اوپر آسمان رہ جائے اور پاؤں کے نیچے زمین اور زمین بھی وہ جو کسی بھی وقت آپ کو کھڑے ہونے کے حق سے بھی بے دخل کر دے۔ اودیبا اب ایک مسلسل خوف کا شکار تھی، کیوں کہ جس طرح مسز عمر اُس سے آئے دن شادی کا تذکرہ کرتی، ممکن ہے صفان علی بھی ایسی ہی حالت سے گزر رہا ہو۔

کچھ دن بعد ادیوا نے صفان سے ایک انوکھی بات کر دی۔

"صفان! مجھے یقین ہے ہماری طلاق نہیں ہوئی۔ میں تمھاری زندگی میں ہوں اب بھی بالکل ویسے ہی۔"

صفان سوچ میں پڑ گیا اور پھر ایک دم سے ادیوا کو حلالہ کرنے کا کہا۔

"حلالہ ......؟ صفان! مجھے اس کے بارے میں علم نہیں ہے...... یہ کیا ہے؟ کیا کرنا ہو گا؟"

"ادیوا! میں تمھیں شام میں کال کر کے سمجھاؤں گا کسی مفتی سے پوچھ کر۔"

ادیوا کو جیسے تسلی سی ہوئی اور وہ بے چینی سے شام کا انتظار کرنے لگی۔

اور پھر صفان علی کا فون آ گیا۔

"ادیوا! وہ میں نے پتہ کیا ہے۔۔۔ لیکن اس کے لیے تمھیں شادی کرنا پڑے گی کسی اور سے اور پھر تم سے شادی میرے لیے جائز ہو سکتی ہے۔"

ادیوا چپ چاپ اُس کی بات سنتی رہی۔

"ادیوا! وہ شادی چالیس دن تک ہی چاہیے اور تمھارا اُس انسان سے بالکل ویسا ہی رشتہ ہو، جو شرعی لحاظ سے اُس کے تم پر حقوق ہیں۔"

"صفان ......! اور جب میں اس کرب سے گزر کر تم تک پہنچوں گی، تو کیا تم مجھے قبول کر لو گے؟؟"

وہ ایک دم سے بغیر کچھ سوچے بولا۔

"ہاں کیوں نہیں ......اویوا......!"

اویوا اُس انسان سے یہی جواب expect کرتی تھی۔ اتنی ہی تھی اُس کی اوقات، اُس نے تو گرنے کی ساری حدیں پار کردی تھیں۔ ایک بار پھر اویوا کے لیے ایسا زہر تیار کر کے لایا تھا کہ وہ پینے سے پہلے ہی ایک پل میں کئی سو بار مر جائے۔

"صفان! تم سمجھتے ہو میری محبت کی حد اس حد تک ہے کہ میں اپنی انا، عزت، نفس، تمہارے ہاتھوں لٹوانے کے بعد اب اپنی عزت کی اپنے وجود کی بھی دھجیاں اُڑوا لوں اور وہ بھی کسی غیر مرد کے ہاتھوں؟ اتنا نہیں گری تمہاری محبت میں کہ خوشی سے اپنا آپ کسی کو سونپ کر اس عذاب سے گزر کر تم تک پہنچوں۔ اُس انسان تک جس نے مجھے اپنے گھر سے بے دخل کر دیا۔ میرا سامان اُٹھوا کے ایسے بھجوا دیا جیسے کوئی وصولی ہونے پر گروی رکھی چیزیں لٹاتا ہے۔ تمھیں یاد ہے اُس سامان میں میری تصویروں کا بھی بیگ تھا اور اس بیگ کے اندر میری تصویروں کے اتنے ٹکڑے تھے کہ جتنے ٹکڑے تم نے میری ذات کے......میرے وجود کے کیے ہوں گے......نہیں صفان! اس بار میں اس دلدل کو عبور نہیں کر پاؤں گی۔ اگر میں نے ایک بھی قدم رکھا، تو اندر دھنس جاؤں گی......پھر چاہے تم اگلے کنارے پر کھڑے میرے منتظر ہی کیوں

نہ ہو؟"

صفان اُس کا جواب سُن کر خاموش ہو گیا۔

"تمہیں معافی چاہیے تھی نا...... میں نے تمہیں معاف کیا......اب میں تم سے رابطہ نہیں رکھ سکتی۔"

اُس کے گناہوں کے کفارے ادیبا بھرنے کو تیار نہ تھی۔ لہٰذا اُس کے بعد اُس نے صفان علی سے رابطہ بالکل ختم کر دیا تھا۔ وہ خود بھی کوئی رابطہ نہ کرتا۔

رابطے ختم ہو جائیں، رشتے ٹوٹ جائیں تو بھی محبتوں کو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ جس طرح یادیں حافظہ پر قابض رہتی ہیں اُسی طرح محبت بھی دل سے دستبردار نہیں ہوتی۔

ادیبا دن گزارتی رہی۔ کبھی بہت دل گھبراتا تھا تو ماہا کو بلا لیتی اور اُس کے گلے لگ کر جی بھر کر روتی۔ ظاہری بات ہے اندر کا بوجھ وقت پر باہر نہ نکلے، تو انسان دب کر مر جاتا ہے، اسی لیے وہ اپنی باتیں ماہا سے شیئر کرتی تھی۔ اللہ کے بعد وہ تھی، جو اُس کے ہر دن کے آنسو، ہر دن کی اذیت کی گواہ تھی۔

اس بات کو ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے کہ ادیبا ہر چیز سے گھٹن محسوس کرنے لگی۔ نہ گھر میں دل لگتا نہ باہر جانے کو جی چاہتا۔ ایک خالی پن تھا، جو

اس کی روح میں دَر آیا تھا اب وہ صفان علی کے ظلم سے زیادہ اُس کی محبت کو یاد کرنے لگی۔ پھر سے وہی کیفیت ہوتی گئی، اس کا دل چاہا کہ وہ رابطہ کرے اس سے، مگر اس کی کہی ہوئی وہ آخری بات ذہن سے جاتی تو ہی وہ کچھ اور کہہ پاتی۔

کبھی کبھی ہم خود اپنے لیے اذیتوں کا سامان کرتے ہیں۔ جان بوجھ کر دوسرے انسان کو اتنا موقع دیتے ہیں کہ وہ کھلونے کی طرح ہمارے جذبات سے کھیلتا ہی رہے۔ جب انسان نے تکلیف کی آخری حد دیکھ لی ہو، تو پھر اور کسی چیز کا خوف اُس کے دل میں نہیں رہتا۔ وہ ہر خطرے میں بے خوف وخطر کود پڑتا ہے جیسے وہ کسی موت کے کنویں کا مداری ہو۔ ادیبا بھی اب موت کے کنویں کی وہی کرتب باز تھی۔ اب کوئی درد کوئی تکلیف بھی آ جائے، اُس کو متاثر نہیں کر سکتی۔

ادیبا مسز عمر کے کمرے میں آئی۔

"ماما! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔"

"ہاں بیٹا! بولو۔"

ادیبا اس طرح کبھی نہیں آئی تھی، اس لیے اُنھیں ذرا تشویش ہوئی۔

"ماما! آپ مجھے ذکیہ پھوپھو کے پاس امریکا جانے کی اجازت دے دیں۔ میں کچھ عرصے کے لیے یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں۔ میرا دم گھٹتا ہے

اس ہوا میں سانس لینے سے۔"

"کیوں کہ ان ہی ہواؤں میں وہ بھی سانس لیتا ہے۔"

دھیرے سے دل میں خود سے کہہ کر ادیوا اب اپنے جواب کی منتظر تھی۔

مسز عمر کو اُس کے جانے سے اعتراض نہیں تھا۔ مگر اس حالت میں جانے سے اُن کا دل بہت خوفزدہ تھا۔ پچھلے دو سالوں سے وہ کوئی بیس رشتے ٹھکرا چکی تھی، کیوں کہ یہ حقیقت ہے انسان وہی جگہ کسی دوسرے کو دیتا ہے، جو پہلے سے خالی ہو...... جہاں یادوں کے، کدورتوں کے آسیب بستے ہوں، وہاں سے لوگ ڈرتے ہیں، وہاں بس نہیں سکتے اور ادیوا کا دل بھی وحشت زدہ تھا۔

"ادیوا! میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اگر تم نے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے نا! تو ایک بات یاد رکھنا...... تم سات سمندر پار تو کیا کسی غیر دریافت شدہ جزیرے پر بھی چلی جاؤ نا! تو بھی جو ویرانیاں تم اپنے اندر اُتار چکی ہو، وہ تمھیں ایسے ہی بے چین رکھیں گی بہتر ہے کہ کہیں بھی جانے سے پہلے تم اپنی روح سے سارے بوجھ اُتار کر جاؤ......"

"جن ویرانیوں کو آپ رُوح کا بوجھ کہہ رہی ہیں نا ماما! وہ میرے لیے میری آخری پناہ گاہ کی طرح ہیں۔ مجھے دنیا میں آپ کسی بھی نئے رشتے

کا پابند کر دیں، مجھے چاہے آپ کسی راجا کی سلطنت کی رانی بنا دیں، میری میت کو بھی تاج محل جیسا مقبرہ بھی نصیب ہو جائے نا ماما......! تو بھی میری روح تب تک بھٹکتی رہے گی جب تک مجھے انہی ویرانوں میں سپردِ خاک نہ کیا گیا۔ یہی میرا آبائی قبرستان ہیں۔"

کاش کہ ادیوا یہ سب ماں سے کہہ بھی سکتی......وہ تو بس اُن کی باتوں کے جواب میں بس یہ کہہ پائی۔

"جی......ماما!"

عمر حیات کی پوری فیملی کے پاس امریکا کے پانچ سال کے ویزے لگے ہوئے تھے، اس لیے ادیوا کو ویزے کے لیے اپلائی نہیں کرنا پڑا۔

ادیوا کی صبح ۳ بجے کی فلائیٹ تھی۔ وہ رات ۱۲ بجے ایئر پورٹ پر پہنچ چکی تھی کیوں کہ ملہا اُس سے وہیں ملنے آ رہی تھی سب سے مل کر اور خوب تسلیاں دے کر ادیوا اندر لاؤنج میں آ چکی تھی۔

اب جیسے جیسے اس کے جانے کا ٹائم قریب آ رہا تھا اس کا دل پھر سے اپنی پرانی پناہ گاہوں کے لیے تڑپنے لگا۔ اُسے صفان علی سے دُور جانے کے خیال نے اس حد تک کمزور کر دیا کہ اُس نے پھر اُس کو فون کر دیا۔ ادیوا کا نمبر سکرین پر دیکھتے ہی وہ فون چھت پر لے آیا اور ادیوا کی آواز اس وقت سن کر وہ بھی کچھ پریشان سا ہو گیا۔

"سب ٹھیک ہے نا......"

پتا نہیں کبھی وہ شخص اتنی پرواہ کرتا کہ لگتا بس دنیا میں ایک وہی ہے جو ادیبا کا مخلص ہے اور کبھی سفاک ظالم......

"صفان! میں جا رہی ہوں یہاں سے۔" ادیبا بھری سی آواز میں بولی۔

"ادیبا! ضروری نہیں کہ ہمارا وہ رشتہ نہیں بن سکا تو ہم کوئی واسطہ نہ رکھیں، دیکھو......! ہم دوست بن کر بھی تو رہ سکتے ہیں نا!"

کسی کمزور اور نا کام مرد کا آخری جملہ شاید یہی ہوتا ہے۔ ورنہ وہ مرد ہی کیا جو مجبوریوں میں آ کر کسی بے بس عورت کے گلے میں طلاق کا طوق پہنائے اور پھر اس کو اپنی ذات کے علاوہ کچھ دیکھنے کے قابل نہ چھوڑے۔

مجبور تو بس محبت ہوتی ہے اور وہ بھی ادیبا کی محبت جو بار بار ادیبا کو اسی کے آگے کشکول دے کے بھیجتی ہے جو خود قابلِ ترس ہے۔ جس کے پاس دینے کو محرومیوں اور سزاؤں کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔

آج کیلیفورنیا میں ادیبا کو پانچواں دن تھا۔ ذکیہ پھوپھو کے دو بیٹے تھے جو نیویارک settled تھے ان کی شادیاں ان کی مرضی سے ہوئی تھیں اور جاب کی وجہ سے وہ کیلیفورنیا بھی کم ہی آ پاتے۔

ادیبا اگر گھر بیٹھتی، تو شاید اُن ہی سوچوں کے ہاتھوں ویسے ہی

اذیت کا شکار رہتی، اس لیے اُس نے زبیر انکل کے ویئر ہاؤس میں کام شروع کر دیا۔ وہ اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ ہینڈل کرتی۔ اویلا کی اکاؤنٹنگ Grip قدرے Strong تھی کیوں کہ اس کی specialization اسی میں تھی۔

کچھ ہی دن میں وہ آفس کا سارا کام سمجھ گئی۔ وہیں آفس میں accountant وقار، اویلا سے بہت متاثر ہوا۔ پہلے دن سے ہی وہ جس انداز سے کام کرتی کبھی ادھر اُدھر دھیان نہ جاتا، اُسے کون دیکھ رہا ہے، کون کیا بات کرتا ہے، کیا سوچتا ہے۔ اس کے بارے میں وہ ہر چیز سے بے خبر ہوتی، اگر کوئی چہرا تھا، تو وہ صفان علی کا...... اُسے یوں لگتا کہ جیسے وہ جہاں سے گزرے گی وہ بس کہیں نہ کہیں سے اُسے دیکھ رہا ہوگا۔ اتنی شدت سے اُس کی موجودگی محسوس کرتی کہ دل چاہتا بس وہ سامنے آ جائے...... وہ جہاں کہیں ہے بس آ جائے۔

اویلا اور صفان کے بیچ ایک بار پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے۔ اویلا کے دن کی پوری ڈیٹیل صفان علی کو پتہ ہوتی...... اویلا کو کچھ خبر ہی نہیں ہوتی تھی کہ آس پاس بھی کوئی دنیا بستی ہے۔ وہ کام ختم کر کے ایک پارک میں جا کر بیٹھی رہتی۔ اُسے سوچتی، اُسی کو اپنے اردگرد کے ہر منظر میں ڈھونڈتی اور پا بھی لیتی...... وقار اُسے نا

چاہتے ہوئے اوبز رو کرتا رہتا۔ کچھ تو الگ تھا اویا میں، جو وہ اُس کی شخصیت کی طرف کھینچا چلا آتا تھا۔

ضروری تو نہیں ہے کہ خوشیوں کے نور سے ہی چہرے روشن ہوں کبھی کبھی کچھ دکھ بھی آپ کو اتنا سنوار نکھار دیتے ہیں کہ آپ کا چہرہ لوگوں کی بھیڑ میں چودھویں کے چاند کی طرح چمکنے لگتا ہے۔ آپ کی ذات الگ ہی دکھائی دیتی ہے۔

یہ تو بات حقیقت ہے کہ جب کسی بے گناہ بے قصور کو سزا دی جاتی ہے، تو اس میں اللہ کی طرف سے اتنی روشنی بھر دی جاتی ہے کہ وہ اس تاریک دنیا میں چاند ستارے کی طرح ہی چمکتا ہے۔

جانے کتنے ہی لوگ اویا کی شخصیت سے متاثر تھے۔ مگر وہ صفان علی جیسے سراب کے پیچھے بھٹک رہی تھی۔ بے منزل راستوں پر چلنا اُسی طرح اذیت دیتا ہے جس طرح آپ کو پتا ہو کہ اگلا سانس آپ کا آخری سانس ہے، پر پھر بھی لاکھ کوشش کے باوجود آپ وہ سانس لینے سے خود کو روک نہیں پاتے۔ صفان علی بھی اویا کے لیے وہی آخری سانس کی طرح تھا، جسے اگر وہ روکتی، تو بھی موت یقینی تھی اور اگر لیتی تو بھی۔

آج اُس کا دل بہت اُداس تھا۔ وہ صفان علی سے بات کرتے جانے کتنی بار روئی تھی۔ وہ اس کو نہ اپنی زندگی میں شامل کر سکتا تھا اور نہ اس

کی زندگی سے جا سکتا تھا۔عجیب امتحان تھا دونوں پر۔

"اویا! میں وعدہ کرتا ہوں کہ جنت میں اللہ سے تمھارا ساتھ ہی مانگوں گا۔وہاں تم میرے ساتھ رہو گی۔"

اویا دل ہی دل میں تڑپ کر رہ گئی۔

"تم تو میرا اس دنیا میں ساتھ نہیں دے پائے صفان......! وہاں کیا دو گے اور تم نے سوچ کیسے لیا کہ تم مجھے اللہ سے مانگو گے اور وہ مجھے پھر سے تمھارے ہاتھوں ٹوٹنے کے لیے تمھیں ہی سونپ دے گا؟ انسان ناانصافیاں کرتے ہیں، اللہ نہیں کرتا......"

اویا کو اِسی طرح چھ ماہ گزر گئے۔وہ گھر سے جاب اور اس کے بعد کچھ دیر پارک میں صفان سے بات کر کے واپس گھر......بس یہی تھیں اُس کی مصروفیات۔

مسز عمر نے اویا سے فون پر بات کرتے ہوئے اس کی خیریت دریافت کرنے کے بعد پھر سے شادی کے موضوع پر بات کی ،تو اویا نے ضروری کام کا بہانہ کر کے فون بند کر دیا۔کیا کرتی وہ اُس کی حالت کوئی بھی سمجھ نہ پاتا شاید۔اگر وہ کسی کو بتاتی بھی تو۔

ایک دن وہ پارک میں بیٹھی تھی کہ وقار آ کر اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اُس سے بیٹھنے کی اجازت لینے لگا۔اویا نے نے کہا۔

"کیوں نہیں ...... بیٹھیے!"

اور خود اُٹھ کر چل پڑی۔

وہ پیچھے بھاگا۔

"ادیبا! پلیز ...... میری بات تو سن لیں۔"

"وقار صاحب! اگر آفس کے علاوہ کوئی بات ہے، تو وہ میں نہیں سنتی اور اگر آفس سے متعلق کچھ کام ہے، تو اس پر کل آفس میں ہی بات کریں گے۔"

"ادیبا! پتا نہیں کیوں مجھے آپ کی شخصیت میں ایک عجیب سی کشش، کوئی گہرائی سی محسوس ہوتی ہے۔ میں جتنا آپ سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں، اتنا ہی دماغ آپ کے بارے میں سوچتا ہے۔"

"وقار صاحب! میں آپ کی عزت کرتی ہوں۔ مہربانی ہوگی، اسے قائم رہنے دیں اور ویسے بھی میں یہاں اپنے شوہر کی کال کا انتظار کر رہی تھی ......"

ادیبا خود کو اسی انسان کے سائے تلے محفوظ کر لیتی، جو اسے زندگی کی تپتی دھوپ میں جل جانے کو چھوڑ گیا، جب بھی اسے کوئی غیر سائے اپنی طرف جھکتے محسوس ہوتے، وہ خود کو صفان علی کے سراب میں محفوظ سمجھنے لگتی ......

بھلا سراب بھی کبھی محافظ ہوتے ہیں ...... وہ تو بس بھٹکاتے ہیں۔

اس کے بعد وقار نے ایک بھی اور بات نہ کی اور یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا......

"میں معذرت خواہ ہوں۔"

اودیا اُسے جاتا ہوا دیکھتی رہی کہ اچانک اُسے خیال آیا کہ صفان کو کال کرنے کا ٹائم ہو چکا ہے۔اس نے پاکستان فون ملایا، تو صفان نے کہا۔

"میں مصروف ہوں ......بعد میں بات کروں گا۔"

عجیب سی اُکتاہٹ تھی اُس کے لہجے میں، اودیا سمجھ نہ پائی۔خیر گھر آ گئی۔ کچھ دیر ذکیہ پھوپھو اور زبیر انکل کے ساتھ وقت گزار کر وہ بالکونی میں چلی گئی اور صفان کو فون کیا۔

کافی دیر بیل جانے کے بعد اُس نے فون اٹھایا اور بہت ناگواری سے بولا۔

"تمھارا مسئلہ کیا ہے اودیا! تم کیوں مجھے سکون سے رہنے نہیں دیتیں۔نہ جینے دیتی ہو......میری سدرہ سے منگنی تھی آج اور وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہے ...... وہ بھی تمھارے آگے ہاتھ جوڑنے کو تیار ہے کہ ہماری زندگی سے نکل جاؤ پلیز! اور جو تم نے محبت محبت کی رٹ لگائی ہے نا! تو سُن لو کہ محبت تو اُسی دن ختم ہو گئی تھی میرے دل سے تمھارے لیے جس دن تم نے میری ماں سے بدتمیزی کی تھی اور اپنی رگیں کاٹیں۔ میں تو تمھاری خوشی کے

لیے تم سے بات کرتا رہا...... لیکن اب مزید نہیں...... میری نئی زندگی شروع ہو رہی ہے اور چھایا آنٹی امی کی بہنوں کی طرح ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ سعدیہ کو کوئی بھی دُکھ ہو کبھی...... یہ میرا ظرف تھا کہ میں تم سے اتنے سال بات کرتا رہا......"

ادیبا کو ایک پل کے لیے لگا کہ وہ محض اک سراب نہیں تھا وہ اُس سے بھی بڑا گورکھ دھندا تھا۔ وہ ایک ایسی بھول بھلیاں میں تھی کہ جس کا ہر راستہ بند تھا اور اس کا ہر چور راستہ اندھے کنویں کی طرح تاریک تھا...... وہ اندر بھٹکے گئی، روئے گئی مگر وہ گورکھ دھندا اسے مزید اُلجھائے گیا، اُسے صحیح راستے پر آنے دے گا اور نہ صحیح راستے کا سراغ بتائے گا۔

"صفان علی! تو میرا یہ قصور بھی ہے کہ میں تمھاری ماں کے خاندان میں سے نہیں ہوں، کیوں کہ مجھے دکھ دیتے ہوئے تمھارے گھر کے کسی ایک بھی انسان کو فرق نہیں پڑا...... آج تمھیں سعدیہ کی فکر ہو گئی اللہ غارت کرے ایسی لڑکیوں کو جو اپنے گھر بسانے کے لیے دوسرے کے گھروں کے ٹوٹنے کی منتظر ہوتی ہیں...... اُن نئے گھروں کی تہوں میں پرانے ٹوٹے گھروں کا ملبہ بھی ہوتا ہے...... اپنی نئی بیوی کو یہ بات ضرور بتا دینا کہ اُس کے نئے گھر کی تہ سے، ملبے تلے دبے مکینوں کی سسکیاں اور آہیں سنائی دیں نا! تو بھی گھر چھوڑ کر نہ جائے...... یہاں قبضہ کرنے والے ناک میں ہوتے ہیں۔ اور کیا

کہا تم نے صفان علی......! تمھارا ظرف تھا......واہ ...... تمھارا ظرف ہی تو دیکھ رہی ہوں میں اب تک...... یہ تمھارا ظرف ہی ہے کہ میری زندگی پل صراط سے گزر رہی ہے...... میں آبلہ پا ہوتے ہوئے بھی کہیں ٹھہر نہیں سکتی...... شل کر دیا ہے تم نے میری آوازوں کو...... میری صدائیں بھی گونگی ہو گئی ہیں......تم ظرف کی بات کرتے ہو؟......تو مجھے دیکھو زندگی کے دشت میں تنہا سفر کیا ہے۔تھک کے ٹوٹی بھی تو اجنبی ہاتھ نہیں تھامے میں نے...... تمھارے جتنا ظرف میرا ہوتا ، تو میرے اردگرد بھی بہاریں ہوتیں...... کہیں میلے، تو کہیں شہنائیاں سنائی دیتیں۔ یہ جو میری زندگی کی بے رونقی ہے...... یہ تمھارے ظرف کے ہی کمالات ہیں۔تم نے تو میرے ساتھ وہی سلوک کیا صفان علی! جو لوگ لاوارثوں کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن تم شاید جانتے نہیں کہ میرا وارث ہے۔ اللہ ہے میرا وارث اور اب میرا وارث ہی تم سے میرے ساتھ کیے گئے سلوک کا حساب لے گا، اب تم سے میرے مالک کے کٹہرے میں ہی بات ہو گی، اسی دن ہو گا انصاف ......صفان علی! آج تم آخری بار بات کر رہے ہو ادیوا عمر سے...... آج کی تاریخ کہیں لکھ لو اور یاد رکھنا......احساسِ ندامت اور احساسِ گناہ دونوں کا بوجھ ہی روح پر بھاری ہوتا ہے......اگر احساسِ گناہ کا ادراک ہو جائے ،تو ندامت کا احساس اپنے آپ ہونے لگتا ہے۔ انسان وہ سب بھی سننے لگتا ہے، جو اُس کے ضمیر نے اُس

سے کہا بھی نہیں ہوتا......"

وہ روتی ہوئی بس بولتی چلی گئی......

"تمہیں پتہ ہے صفان علی! کسی کو زندہ درگور کرنے کے برابر ہے کہ آپ اُس کی دل شکنی کریں اور ایک بار نہیں بار بار کریں۔ کبھی تم نے سوچا ہے صفان! کہ بار بار تمہارے ہی ہاتھوں تذلیل کیوں کرواتی ہوں، کیوں کرچی کرچی ٹوٹا دل جوڑ کے پھر سے تمہارے ہی ہاتھوں میں دیتی ہوں؟ جب کوئی اپنا آپ ہمیں کھلونے کی طرح سونپتا ہے نا! تو اس کے مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ بے وقوف ہے...... دراصل وہ اپنی محبت کو کندن بنا دیتا ہے آپ اپنا جلا جلا کے...... تم نے بھی میری محبت کو کندن بنا دیا ہے صفان! اور اب یہی کندن تمہاری روح پر ٹپکتا رہے گا ایندھن بن کے...... احساسِ ندامت میں جلو گے تم ایک دن......اور ہاں آئندہ کسی کی اتنی ہی ہتک کرنا کہ جو بعد میں احساسِ گناہ نہ بنے ......ورنہ پچھتاوے عمر بھر کے روگ بنتے دیر نہیں لگتی......صفان علی!"

دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔ شاید وہ کسی سکتے میں تھا یا فون سائیڈ پر رکھ چکا تھا، لیکن اودیا نے بس آخری جملے بولے اور فون بند کر دیا۔

"صفان علی! میں تمہیں وہ سب معاف کر سکتی تھی، جو تم نے اپنا یک طرفہ فیصلہ مجھ پر مسلط کیا تھا، لیکن میں تمہیں یہ تین سال کبھی معاف نہیں

کروں گی، جو تم نے مجھے جھوٹی محبت کا یقین دلانے میں لگائے ...... مجھے بھی کہتے رہے کہ اگر میں کسی اور سے شادی کروں، تو تمھیں دکھ ہوگا، تم hurt ہو جاؤ گے۔ کتنے خود غرض انسان نکلے تم ...... میں نے تو اپنے لیے تنہائیاں چن لیں، پر تمھیں یہ دُکھ نہیں دیا۔"

اب اودیوا کے ضبط کی حد ختم ہو گئی تھی ...... وہ ٹوٹ گئی تھی ایک بار پھر ......اور آج وہ ایسے روئی تھی جیسے صفان علی نے آج اُسے اپنی زندگی سے بے دخل کیا ہو......

اودیوا کو صفان علی کی طلاق آج سنائی دی تھی۔ تین سال اُس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے رُسوائی ہاتھ آئی بس......

اگلے دن ہی اودیوا نے پہلی فلائٹ لی اور پاکستان واپس آ گئی۔

صفان علی کا آسیب جا چکا تھا۔ اُس کے دل سے اب اُس آسیب کے اثرات کا عمل رہ گیا تھا۔ وہ اُس کے اثرات کو زائل کرنے کی ناکام کوششوں میں تھی۔ دو سال کا مزید عرصہ پاکستان واپس آ کر اُسے پل پل خود سے لڑنا پڑا......

☆☆☆

"اودیوا! چلو بیٹا! جلدی سے ریڈی ہو جاؤ...... تمھارے ماموں کی فلائیٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔"

فلائٹ لینڈ ہونے کے کچھ ہی دیر بعد شجاع ماموں اپنی فیملی کے ہمراہ باہر آئے، تو آگے عمر حیات کے سب گھر والوں نے اُن کا بہت پُرتپاک استقبال کیا۔ عنائیہ، ہانیہ دونوں ہی بہت decent لگ رہی تھیں، باپردہ اور بالکل الگ سی چمک اُن کے چہروں پر تھی ۔ ذریاب شجاع بہت ہی مودب طریقے سے عمر حیات اور مسز عمر حیات سے پیش آیا۔ اشعر اور حادی کے ساتھ بالکل سلجھے ہوئے انداز میں بات چیت کرتا رہا، اُسے دیکھ کے لگتا ہی نہیں تھا کہ مغربی ملک میں رہتے ہوئے اُس نے وہاں کی ثقافت اور طور طریقوں کا کچھ رتی برابر بھی اثر اپنی شخصیت پر ہونے دیا ہو۔ اُس کی عینک کے پیچھے چھپی آنکھوں میں اتنی حیا تھی، جیسے کہ ایک مرد کی آنکھوں میں ہونی چاہیے۔ نظر کا چشمہ اُس کے چہرے پر ایسے سوٹ کر رہا تھا، جیسے اُس کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہو۔ سب سے رسمی ملاقات کے بعد وہ ادیبا کی طرف متوجہ ہوا، جو عنائیہ اور ہانیہ سے باتوں میں مصروف تھی۔

"السلام علیکم ......ادیبا! کیسی ہیں آپ؟"

وہ ادیبا کو جن نظروں سے دیکھ رہا تھا، اُس سے صاف صاف عزت اور تکریم کی جھلک نمایاں تھی۔

"جی ذریاب! میں ٹھیک ہوں کیسا رہا آپ کا سفر؟"

"الحمدللہ! کرم ہے اللہ کا ...... بہت اچھا رہا سفر۔ حالاں کہ بہت

you can see we all are تھی، مگر long flihght fresh"

اویا مسکرائی اور پھر سب گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ایئرپورٹ سے عمر حیات کا گھر مشکل سے بیس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔

ناشتہ کرنے کے بعد مسز عمر نے سب کو ان کے کمرے دکھائے اور پھر وہ لوگ کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔عنائیہ اور ہانیہ کا کمرہ اویا کے روم کے سامنے تھا جب کہ ذریاب حادی کے روم میں ایڈجسٹ ہو گیا تھا۔شجاع ماموں اور ممانی کو گیسٹ روم کے ساتھ والا بیڈ روم دیا گیا، جو کہ اشعر کے روم کے ساتھ تھا۔

اویا صبح جلدی اٹھی تھی، تو اس لیے وہ بھی جا کر لیٹ گئی۔ویسے بھی وہ مشکل سے ایک گھنٹہ بھی نہیں سو پائی تھی۔رات کا جاگنا تو اب جیسے اُس کی قسمت میں لکھا جا چکا تھا۔

اویا کا کمرا چوں کہ بالکل کارنر پر تھا، اس لیے وہ سب سے زیادہ تاریک تھا۔وہاں پردے ہٹا کے بھی روشنی نہ ہونے کے برابر اندر آتی۔باقی کچھ اندھیرے اُس کے اپنے پھیلائے ہوئے تھے۔خیر وہ مزید اندھیرے کے لیے لائٹ آف کر کے لیٹ گئی۔اتنا اندھیرا تھا کہ کمرے میں کیا چیز کہاں ہے، کچھ اندازہ ہی نہ ہوتا تھا بالکونی ذرا سائیڈ پر تھی اور اس کے آگے

پردے اتنے بھاری تھے کہ روشنی کی ایک جوت تک اندر داخل نہ ہوسکتی تھی۔

شام ہوئی، تو عنائیہ ہلکی سی دستک کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔

''ادیوا! اتنے اندھیرے اتنے سناٹے سے ڈر نہیں لگتا تمھیں؟ کیسے نیند آجاتی ہے اپنے کمرے کو قبر بنا کر تمھیں؟ توبہ ہے میرا تو دم گھٹنے لگا ہے ادیوا...... ! کچھ تو زندگی کے آثار رہنے دو اپنے اردگرد......''

اور عنائیہ نے فوراً لائٹ جلا دی۔

''آپی! آپ کو پتا ہے کہ قبرستان تاریک سنسان کیوں ہوتے ہیں؟ کیوں کہ ان کے اندر لاشیں دفن ہوتی ہیں بے جان لاشیں...... اکثر ویسے ہی قبرستان ہماری اپنی چھوٹی بڑی غلطیوں کے نتیجے میں ہمارے اندر بھی دریافت ہوجاتے ہیں اور پھر اس قبرستان میں ہم اپنی آرزوئیں دفناتے ہیں اور کچھ آرزوؤں کو تو اتنی بھیانک موت آتی ہے کہ کفن بھی نصیب نہیں ہوتا...... وہ آرزوئیں بھٹکتی رہتی ہیں ہمارے اندر...... اور مردے بھٹکتے رہیں، تو سناٹے کہاں رہتے ہیں آپی! میرے اندر کی رونق سے تو آپ واقف ہی نہیں ہیں۔''

''اور آپی! کیا واقعی ہی بظاہر نظر آنے والے اندھیرے کے پیچھے آپ کو اس آگ سے نکلتی روشنی دکھائی نہیں دیتی...... جو میری روح کے جنگل کو جلا کے راکھ کر رہی ہے؟؟ کیا آپ کو واقعی ہی اندھیرا محسوس ہوتا ہے

میرے آس پاس؟""

اب وہ دل ہی دل میں اپنے آپ سے مخاطب تھی۔

"آپی! یہ اندھیرا یہ سناٹے میری قبر کی پہچان ہے۔آپ میرے کمرے سے فاتحہ پڑھ کے گزر جایا کریں۔اندر آئیں گی، تو واقعی ہی دم گھٹ جائے گا آپ کا...... کیوں کہ مُردوں کی دنیا میں زندہ لوگ واقعی ہی سانس نہیں لے سکتے......"

وہ اندر ہی اندر خود سے مخاطب تھی کہ عنائیہ کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"دیوا! تمھیں پتا ہے کہ تمھیں اس حال میں دیکھ کر ہم سب کو تکلیف ہوتی ہے۔پانچ سال کی سزا کوئی چھوٹی سزا نہیں ہوتی اور تم نے کس بنیاد پر زندگی کو روک دیا ہے...... جب تمھیں پتا ہے کہ تم بے قصور تھی، پھر نہ کردہ خطا کی سزا دی گئی ہے......

(کبھی بھی سزائیں نہ کردہ گناہوں کے نتیجے میں نہیں دی جاتی۔کہیں نہ کہیں رتی برابر ہی ہمارا اپنا بھی قصور ہوتا ہے)۔

تم اپنے ساتھ تو وفا کرو، اپنا آپ تو خود کو سونپ دو۔پتا ہے اپنی ذات کا سہارا بھی بہت بڑا سہارا ہوتا ہے۔انسان ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزرتا ہے، تو آخر میں اپنی کرچیاں خود سمیٹ سکتا ہے پھر سے، کسی بے

فیض سہارے کی چاہ نہیں رہتی پھر۔"

ادیوا سب کچھ چپ چاپ سنتی رہی۔عنائیہ کو اُس کا صرف وہ دُکھ پتا تھا، جو پانچ سال پہلے صفان علی نے میڈل کے طور پر اُس کو نوازا تھا۔عنائیہ اُس سے یکسر لاعلم تھی، جو مسافت اُس نے تین سال اور اُسی سراب کی آرزو میں کاٹی...... اُسے تو خبر تک نہیں تھی کہ ادیوا کی روح کے گھاؤ سالوں کیا صدیوں پر بھی محیط ہوتے، تو بھی ایسے ہی تازہ رہتے جیسے حادثہ کو ہوئے ابھی ایک ہی دن گزرا ہو۔

"آپی! آیئے...... لان میں واک کرتے ہیں۔" اس نے بات بدل کے کوئی اور موضوع شروع کرنا چاہا۔

"او کے! ٹھیک ہے، لیکن میرے خیال سے مغرب کا ٹائم ہو رہا ہے۔چلو! پہلے نماز پڑھ لیتے ہیں۔"

ادیوا نے اسبات میں سر ہلایا۔ادیوا مشکل سے فجر کی نماز پڑھتی تھی۔وہ بھی اگر اُس کا دل چاہے تو......

عنائیہ اور اس کے گھر کا ایک ایک فرد پانچ وقت نماز کا پابند تھا۔پرورش اچھی ہو، تو اُسے کسی کے ثبوت یا گواہی کی ضرورت نہیں پڑتی۔وہ خود اپنا آپ محسوس کرواتی ہے۔مسز عمر اور عمر حیات دونوں نماز کے پابند تھے، مگر ان کے بچے اس لائن سے ذرا ہٹ کے مرضی کے مالک تھے۔

رات کے کھانے کے بعد سب لاؤنج میں موجود تھے کہ ممانی نے سب کے لیے تحائف نکالے اور اشعر، حادی اور ادیوا کو دیے۔ ادیوا کے لیے ایک اسلامک کیلی گرافی کا canvas تھا جس پر قرآن پاک کی بہت خوبصورت آیت اُردو ترجمے کے ساتھ بہت ہی خوبصورت انداز میں لکھی ہوئی تھی۔ آرٹسٹ کا ہنر اور قرآن پاک سے محبت صاف صاف دکھائی دے رہے تھے جس خوبصورتی سے اس کی شیڈنگ کی اور کلر کنٹراسٹ منتخب کیا گیا تھا.....وہ سب بہت خوبصورت تھا۔

ان اللہ مع الصابرین

"اور بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

"ادیوا.....بیٹا! میں چاہتی ہوں کہ آپ اسے اپنے کمرے میں لگاؤ۔ آپ کے روم میں مَیں نے کبھی کوئی قرآن پاک یا کوئی اسلامی شیلڈ اور فریم نہیں دیکھے۔ ایسی چیزیں گھر میں لگانے سے برکت رہتی ہے۔"

"جی ممانی! میں آج ہی لگاتی ہوں بہت اچھا canvas ہے thank you very much۔"

اب ادیوا، عنائیہ اور ہانیہ ادیوا کے روم میں بیٹھی گپ شپ میں مصروف تھیں۔ وہ دونوں اپنے کالج اور یونی ورسٹی کے قصے سنانے میں مصروف تھیں کہ اچانک حادی اور ذریاب اندر آئے۔

"ارے بھئی! ہم لوگ وہاں بور ہو رہے ہیں اور آپ لوگ یہاں ہو۔ that's not fair۔" حادی گلا کرنے لگا۔

"تو آپ لوگ بھی تشریف رکھیں نا!" عنائیہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

اب وہ دونوں آپس میں باتوں میں مصروف ہو گئے اور ادیوا، ہانیہ سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ ادیوا کا بولنے کا، بات کرنے کا انداز اتنا اچھا تھا، اتنا دھیما، دیکھنے والا اور سننے والا دونوں ہی مسحور ہو جاتے۔

ذریاب شجاع نا چاہتے ہوئے بھی ادیوا کو دیکھتے رہنے پر مجبور ہوتا گیا۔ کچھ بات تھی کچھ الگ تھا اس میں، اس کے چہرے کا پُرنور ہونا، اس کے لہجے کا شائستہ پن، اس کی آنکھوں کی حیاء...... سب کچھ ہی تو سحر انگیز تھا۔

کبھی کبھی کچھ چیزیں ہمارے اختیار سے بہت دُور جا کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ہماری پہنچ سے کہیں دور...... اور ایسے ہی جذبات ذریاب شجاع کے تھے۔ ادیوا کے لیے...... جنھیں وہ اپنے اختیار میں لانے کی سرتوڑ کوشش میں تھا۔

اگلے دن سب کا پلان تھا کہ شام کی چائے کے بعد lake view park کا وِزٹ کیا جائے۔ کھانے کے بعد ادیوا، عنائیہ اور ہانی کے ساتھ

اوپر کمرے میں آ گئی۔ ہانیہ شام کے لیے کوئی ڈریس منتخب کرنے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"اویا! ظہر کی نماز پڑھ لی؟؟"

عنائیہ اُس سے مخاطب ہوئی تھی۔

"جی آپی! پڑھتی ہوں......"

"پڑھتی ہوں نہیں......ابھی وضو کر کے آؤ۔ میں بھی آ رہی ہوں آج میں نماز تمھارے روم میں پڑھوں گی۔"

اویا نے وضو کیا اور نماز پڑھی......اُسے ٹھیک سے یاد بھی نہیں تھا کہ اُس نے پورے چار فرض پڑھے بھی ہیں یا نہیں......کیوں کہ اُس کا دھیان نماز کے دوران ہی صفان علی کی طرف چلا گیا تھا اور پھر وہ بس سجدے کر رہی تھی۔ جانے کس کے خیال میں، گمان میں تھی۔ یہ سب عنائیہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اچھی طرح واقف تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور اویا کس مرحلے سے گزر رہی ہے۔

اب اویا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور گم صم ہو گئی کہ اچانک عنائیہ کی آواز آئی اور وہ چونک گئی......

"اصل تنہائی تو اب تم پر آئی ہے اویا......! دیکھو اپنے خالی ہاتھوں کو......تمھیں تو حرفِ دعا بھی یاد نہیں......پورے دن کی نمازوں کا کوئی ایک بھی لمحہ ایسا بتاؤ جس میں تم نے اپنے رب کو سجدہ کیا ہو اور وہ تمھیں تمھارے

سامنے محسوس ہوا ہو۔ تمھارے دل کو سکون ملا ہو کہ ہاں وہ ہے تمھیں سنبھالنے کے لیے...... وہ ایک لمحہ بتاؤ جب تم نے خود کو اللہ کے حوالے کیا ہو؟ تم نے اپنا رب بھی گنوا دیا ایک انسان کی محبت کے پیچھے ادیبا......! تمھارے رکوع، سجود اللہ کی محبت سے خالی ہو گئے ہیں۔ تمھارا دل بت پرست ہے، تمھارے سجدے اللہ کے آگے اور دل اس سفاک انسان کی محبت کے لیے تڑپتا ہے۔ ادیبا! کس منہ سے اللہ کے آگے ہاتھ پھیلائے بیٹھی ہو۔ اپنی عبادتوں کا قبلہ تو درست کرو...... اپنے دل سے دنیا کی خواہشیں تو نکالو......"

وہ بولتے جا رہی تھی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں ادیبا! مجھے تمھاری اس حالت سے بہت تکلیف پہنچی ہے۔"

اُس کی آواز بھر آئی......

"اور میں تمھیں اس حال میں نہیں دیکھ سکتی......"

وہ اُٹھ کے کمرے سے فوراً چلی گئی......

ادیبا کا دل چاہا کہ وہ زور زور سے روئے، اتنا روئے کہ اس کی آنکھوں سے صفان علی کی محبت کے خواب ریزہ ریزہ ہو کر بہہ جائیں...... وہ بھاگ جائے کہیں دُور کسی جنگل کسی ویرانے میں...... زور زور سے پکارے اپنے رب کو اُسے واسطے دے، اُس سے کہے۔

"مجھے اپنا سہارا دے دے اے اللہ...... ! اے اللہ! میرے دل کو اپنی محبت سے بھر دے......"

محبت بھی کتنی عجیب چیز ہوتی ہے نا...... ہوتی بھی ہے تو اپنے ہی جیسے بے بس انسانوں سے...... جنھیں نہ نباہ کا پتا، نہ وفا کا......

عنائیہ کی باتیں اُس کے ذہن میں آ کر ایسے ہی قابض ہو گئی تھیں جیسے اُنھیں ادیبا کی مرضی کی بھی پرواہ نہیں، ادیبا انھیں اپنے ذہن میں رکھنا بھی چاہتی ہے یا نہیں۔ وہ باتیں ذہن کے ہر پنہاں خانوں میں جا کر چھپ گئی تھیں، جو وقفے وقفے سے باہر آتیں اور اپنے ہونے کا احساس دلا کر پھر چھپ جاتیں۔

جب کوئی سوچ اس طرح سے آنکھ مچولی کھیلتی ہے نا! تو وہ تب تک ذہن سے نہیں جاتی جب تک وہ ذہن نشین نہ ہو جائے۔ وہ زبردستی کا قبضہ نہیں چاہتی، وہ اپنے پورے مقام اور رُتبے کے ساتھ خود کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے اور پھر وہ مطالبے تو ہر حال میں ماننے پڑتے ہیں جن کا تعلق ہمارے ذاتی سکون سے ہو۔

lake view سب نے ہی بہت انجوائے کیا اور ذریاب ادیبا سے مسلسل باتیں کرنے کی کوشش کرتا رہتا، وہ کسی چھوٹی سی بات میں بھی ہاں ،نہیں کر دیتی، تو وہ اسی میں خوش ہو جاتا۔

اگلے دن ماہا کا فون آیا اور اس نے ادیوا کو گھر آنے کا کہا۔ اُس کے گھر میں کوئی درس و تدریس کی محفل تھی کچھ دن بعد، اس سلسلے میں اسے ادیوا کی ہیلپ چاہیے تھی۔ ادیوا نے مسز عمر سے جانے کی اجازت لی اور انھوں نے عنائیہ کو ساتھ لے جانے کا مشورہ دیا۔ عنائیہ کا حاوی کے ساتھ شاپنگ پہ جانے کا پلان تھا، اس لیے وہ ادیوا کے ساتھ نہ جا سکی۔ مسز عمر نے ذریاب سے ادیوا کو ماہا کی طرف ڈراپ کرنے کو کہا اور وہ خوشی سے راضی ہو گیا۔

ذریاب شجاع کی عادتیں بالکل عام لڑکوں سے مختلف تھیں۔ ایک تو وہ کام کی بات کرتا اور بلاوجہ frank ہونے کی کوشش نہ کرتا۔ اس کی face reading اچھی تھی، اس لیے وہ اندازہ لگا لیتا کہ اگلا بندہ اس سے بات کرنے میں کتنا انٹرسٹڈ ہے۔ ادیوا کے معاملے میں وہ اور بھی زیادہ محتاط ہو جاتا، کیوں کہ وہ اسے خود سے بیزار ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ دل میں اس کے لیے جو بھی جذبات رکھتا تھا، اُنھیں ادیوا تک پہنچانے کی کبھی کوشش نہ کرتا، ویسے بھی جذبات میں سچائی ہو، تو محسوس اپنے آپ ہو جاتے ہیں۔

وہ ظہر کی نماز ادا کر کے گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا اور ادیوا کا انتظار کرنے لگا۔

ادیوا میں اس دن عنائیہ کی باتوں کے بعد ایک change آیا تھا

کہ وہ نماز باقاعدگی سے پڑھنے لگی۔کوشش کرتی تھی کہ دھیان اِدھر اُدھر نہ بھٹکے، کبھی اُسے کامیابی ملتی اور کبھی وہ ناکام ہو جاتی۔

جب دل سال ہا سال تاریکیوں میں گھرے رہے ہوں، تو ان کے اندر کی کالک اترنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔

دریاب ادیبا سے ڈائریکشن پوچھ کر ڈرائیو کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ وہ ایک دم سے گاڑی سائیڈ پر روک کر تیزی سے باہر نکلا۔ادیبا چوں کہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی سمجھ نہ پائی کہ ہوا کیا ہے؟ کچھ ہی دیر میں وہ ایک بلی کا بچہ اٹھائے گاڑی میں بیٹھ گیا۔اس کے چہرے سے انتہائی پریشانی کے اثرات نمایاں تھے۔وہ بلی کا بچہ درد کی شدت سے مسلسل چیخ رہا تھا۔

"ادیبا! یہ دیکھو اس کی leg frecture ہے۔اگر آپ کو دیر نہیں ہو رہی، تو میں اسے پہلے کسی pet ڈاکٹر کے ہاں لے جاؤں؟ پتا نہیں کیسے ظالم لوگ ہیں تکلیف چاہے انسان کی ہو یا کسی بھی اور جاندار چیز کی انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ اُس کی تکلیف کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا کہ کون تھا، جو اس کی یہ حالت کر گیا۔"

ادیبا اُس کی یہ حرکت دیکھ کر بہت متاثر ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد دریاب نے ادیبا کو ملا کی طرف ڈراپ کیا اور واپس چلا گیا۔

ادیبا اب ملا کے ڈرائنگ روم میں تھی۔ ملا شاید کسی کام سے قریبی

سپر مارکیٹ تک گئی ہوئی تھی۔ ادیبا قریب ہی پڑی بک شیلف سے کتابوں کا جائزہ لینے لگی۔

اس کی نظر ایک کتاب پر پڑی، جو کہ غالباً شاعری کی کتاب تھی۔

"اُس نے کہا تھا الوداع" وہ نام پڑھ کر خود کو نہ روک پائی اور بک اٹھا کر پڑھنے لگی۔

سنو!

تم کتنے خوش قسمت ہو نا......

محبت کو ٹھکرا بھی دو تو......

کسی کے خواب جلا بھی دو تو......

دھوکا دے دو

رستہ بدل لو......

ہاتھ چھڑا لو

دامن بچا لو

ہنستا بستا دل کسی کا

چپکے سے تم بنجر کر دو

پتھر کر دو آنکھ میں آنسو

کسی کی دنیا کھنڈر کر دو......

سنو!

تم کتنے خوش قسمت ہو نا......

تم یہ سب کچھ کر سکتے ہو

لیکن

کچھ بدقسمت بھی ہیں

وفا کر کے بھی

نبھا کر کے بھی

جو خالی ہاتھ

اور خالی دامن

صحرا صحرا بھٹک رہے ہیں

دل سے روح تک تڑپ رہے ہیں

خوشیوں کو ترس رہے ہیں

سنو!

تم تو بہت ہی خوش قسمت ہو نا

بس اتنا کر سکھا دو ان کی

اتنی ترکیب بتا دو ان کو

کسی کے دل کے ٹکڑے کر کے

کیسے سکوں سے سو سکتے ہیں

برباد کر کے کسی کی دنیا

کیسے ہم خوش ہو سکتے ہیں......

اُسے لگا جیسے یہ نظم اُسی کے لیے لکھی گئی ہو۔ لیکن اُس کا ذہن اسی ایک لائن کے بیچ الجھا ہوا تھا۔

"پتھر کر دو آنکھ میں آنسو"

کیا حقیقت تھی کیا معانی تھے ان لفظوں کے......؟ بظاہر تو یہ ظلم کرنے والے سے ہی ایک فریاد تھی۔ اگر شاعری کے مفہوم سے دیکھا جاتا تو...... مگر اس کا ایک اور مطلب بھی ہو سکتا تھا...... وہ ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ ماہا آ گئی...... ادیوا نے بک واپس شیلف میں رکھی اور پھر ماہا سے باتیں کرتے کرتے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جن معاملوں میں ادیوا کی ہیلپ درکار تھی، وہ اس نے کی اور پھر ماہا سے اجازت لی۔ دو دن بعد اس کے گھر ورس کی محفل تھی اور ادیوا کو ماہا نے خاص طور پر مدعو کیا تھا۔

ادیوا میں وقت کے ساتھ خوشگوار تبدیلیاں آ رہی تھیں، مگر وہ جو اُس کا سب سے بڑا مسئلہ تھا، وہ وہیں کا وہیں تھا۔ وہ اکثر اداس ہو جاتی۔ جب بھی کچھ یاد آتا اور پھر اُٹھ کر واپس کمرے میں آ جاتی۔ مسز عمر نے عنائیہ سے خاص طور پر کہا۔

"ممی! پلیز اسے کچھ سمجھاؤ..... پانچ سال کا عرصہ بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔اس نے جیسے جیسے جو جو سلوک اپنے ساتھ کیا، ہمارا کلیجہ جلتا رہا۔مگر اس کی ہر بات کو مان لیا۔اس نے کتنے اچھے اچھے رشتے ٹھکرائے۔میں تڑپ کر رہ جاتی ہوں، اس کی یہ حالت دیکھ کر، لیکن بہت ہی بے بس ہوں میں ۔کہاں سے لاؤں وہ خوشیاں، جو اس کے چہرے کی رونق اس کی ہنسی کی وہی کھنک لوٹا دیں۔"

مسز عمر اکثر یہ باتیں کرتے کرتے بے تحاشا رونے لگتیں۔عنائیہ تسلی دیتی۔

"اللہ پر بھروسا رکھیں۔سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاءاللہ!"

کبھی کبھی کوئی دوسرا کتنی بھی کوششیں کر لے، انسان کو حقیقت کا ادراک تب تک نہیں ہوتا کہ جب تک وہ خود اپنے ہاتھوں سے عارضی اور دنیاوی محبتوں کے بت دفنا نہیں دیتا۔اس کے دل کو اُجالے تب ہی عطا کیے جاتے ہیں، جب وہ اپنے دل میں ہی اپنے سب سے عزیز بت کو نظرِ آتش کرتا ہے اور عنائیہ یہ بات بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ ادیبا کو خود اپنے لیے اُجالے کرنے ہیں۔کوئی دوسرا اس کے بت کدے تک رسائی نہیں رکھتا۔

"ادیبا! تم اپنے کمرے میں ہو اور میں تمہیں پورے گھر میں ڈھونڈ کے آئی ہوں۔"

"عنائیہ آپی...... آپ نے کیوں زحمت کی مجھے پورے گھر میں ڈھونڈنے کی، جب کہ آپ جانتی ہیں کہ میرا کمرا ہی میرا گھر ہے۔ میں جب بھی ملوں گی یہیں ملوں گی......"

"ادیوا! ایک بات پوچھوں؟"

"جی آپی! پوچھیں نا، آپ اجازت لے کر بات کب سے کرنے لگی؟"

"ادیوا! تمھیں پتا ہے ہمیں انسان نہیں توڑتے، ہمارے بھروسے توڑتے ہیں ہمیں اور پھر ایک ہی انسان پہ بار بار بھروسا کیوں؟"

ادیوا قدرے محتاط انداز میں حیرت سے اُنھیں دیکھنے لگی، حالاں کہ ادیوا نے کبھی share نہیں کیا تھا کہ اُس نے صفان سے تین سال بعد بھی رابطے رکھے تھے......

"کیا مطلب ہے آپی! آپ کا؟"

"یہ جو اس کی محبت تم ابھی تک دل میں رکھ کے بیٹھی ہو، یہ بھی بھروسا ہی ہے نا......"

"آپی! لیکن میں نے اُس کی اب بھی خواہش نہیں کی......"

"میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا ادیوا! جو محبت آپ کے دل میں تکلیف پانے کے بعد بھی رہ جاتی ہے نا! وہ آپ کے دل کی سب سے بڑی

خواہش ہوتی ہے۔جو اس وقت اپنا ٹھکانا بدل کے آپ کے لاشعور میں آ جاتی ہے اور لاشعور کی باتیں عام حالت میں ظاہر نہیں ہوتیں ......جس دن وہ شخص تمہارے سامنے آیا اور تم نے خود میں ذرا بھی جھکاؤ محسوس نہ کیا ،اس کی طرف تمہارا دل مائل نہ ہوا ،تو سمجھ لینا اب وہ تمہارے لاشعور سے بھی نکل گیا ہے اور تمہارے ظاہر و پوشیدہ جذبات سے بھی اور ویسے بھی......انسان مرتا مر جائے ،لیکن کبھی بھی اُن سہاروں پر بھروسا نہ کرے ،جو کئی بار اُس کی بنیادوں کو ہلا چکے ہوں......دھوکا دینا کچھ لوگوں کے خون میں شامل ہوتا ہے۔وہ ہر بار نیا روپ دھار کے پرانے عزائم کے ساتھ آپ کی زندگی میں آتے ہیں اور آپ کی سب سے کمزور بنیادوں سے اپنے مشن کا آغاز کرتے ہیں۔انسان کو اپنے واحد سچے کھرے اور مستقل سہارے کی پہچان جتنی جلدی ہو جائے ،اچھا ہے ،کیوں کہ اللہ ہی ہے ،جو ہماری زمین بوس بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط کرتا ہے۔میری باتوں پر غور کرنا اویا! باقی میں تو دعا ہی کر سکتی ہوں تمہارے حق میں......"

اور عنایہ اویا کو پھر سے گہری سوچ میں چھوڑ کر اس کے کمرے سے چلی گئی......

اویا کا دل جیسے خون کے آنسو رو رہا تھا۔جس طرح انسان بے بس ہو جاتے ہیں نا! اُسی طرح دل بھی بے بسی محسوس کرتے ہیں۔خاص کر جب

وہ اپنے اندر کی تاریکیوں میں گھٹ رہے ہوں اور پھر بھی اپنے لیے اُجالے نہ ڈھونڈ پائیں۔

کبھی کبھی سب کچھ ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہوتا ہے، مگر ہم جان بوجھ کر انجان بنے رہتے ہیں، کیوں کہ ہم اپنے کمفرٹ زون سے نکلنا نہیں چاہتے۔ہم روز کی تکلیف سہہ لیں گے، لیکن ذرا سی کوشش سے اُس تکلیف کی جڑیں نہیں کاٹیں گے۔

"نئے روپ دھار کے پرانے عزائم کے ساتھ ہماری زندگی میں آتے ہیں......"

ادیوا اس ایک بات کی تہہ تک اترتی گئی...... نا چاہتے ہوئے بھی صفان علی کے عزائم کا موازنہ کرنے لگی۔

"ہم دوست بن کر تو رہ سکتے ہیں نا......!"

اُس کا نیا روپ۔

حقیقت کھلتی ہو، تو کبھی کبھی زیادہ وضاحتوں کی ضرورت نہیں پڑتی...... اپنے آپ کڑی سے کڑی ملتی ہے اور یہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے کہ وہ اُسے اُس بینائی سے نوازتا ہے، جو دل میں لگے زنگ اور اس کالک کو بھی دیکھ لے، جو انسان اپنے بل بوتے پہ کبھی نہیں دیکھ سکتا۔

اگلے روز ادیوا، عنائیہ کے روم میں آئی۔

"آپی! کل کا کوئی پلان ہے آپ کا؟؟"

"نہیں ادیبا......! پلان تو جو بھی ہوگا، تمہارے ساتھ ہی ہوگا۔"

"او۔کے! تو پھر ٹھیک ہے، کل آپ میرے ساتھ ملیحہ کی طرف جا رہی ہیں۔ اُن کے گھر درس کی محفل ہے اور کوئی بہت بڑی اسلامک سکالر آ رہی ہیں۔"

"اچھا دیٹس گریٹ......! میں تو ضرور چلوں گی۔ علم جہاں سے بھی ملے، لے لینا چاہیے اور وہ بھی دین کا علم ہو، تو اس سے اچھا کچھ ہو نہیں سکتا۔ ہم تو پہلے ہی اللہ سے دور ہیں، ہمیں ہمارے مذہب کے بارے میں اتنا نالج نہیں ہے۔ دنیاوی مسئلے ہم سے جتنے مرضی پوچھ لو......"

ادیبا دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

"آپی! آپ نماز تو دل سے پڑھتی ہیں۔ میرے سے تو لاکھوں درجے بہتر ہیں۔ مجھے تو نماز بھی سکون سے نصیب نہیں ہوتی۔"

شام ہوئی اور کھانا کھانے کے بعد سب آئس کریم کھانے صدر نکل گئے۔ ادیبا کی ہنسی سے وہ دُکھ کا دبا دبا سا شور اب کافی کم محسوس ہونے لگا تھا......وہ پھر سے سب کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے لگتی، مگر اکثر کچھ چیزوں کا ذکر آتے ہی اُسے بالکل چپ لگ جاتی جیسے کہ اُس دن حادی کے منہ سے مخصوص coffee chain کا ذکر سنا، تو ادیبا پھر سے اپنے کمفرٹ زون

میں چلی گئی۔ اپنی ذات کے گرد کھینچے دائروں سے ایک تو باہر آتی نہیں تھی اور اگر آجاتی، تو واپس جانے کی رفتار اتنی تیز ہوتی کہ لگتا اب وہ کبھی نکلنے کی ہمت نہ کرے گی...... ذریاب اس کے ایک ایک اتار چڑھاؤ کو بہت خاموشی سے محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ خود کو ہر اس چیز کے ذکر سے روکنے کے لیے تیار کر رہا ہو، جو اس کے چہرے کی مسکراہٹ چھین کے لے جاتی ہے۔ پتا نہیں کیوں، لیکن وہ ادیوا کو بہت خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ شاید کچھ خواہشوں کا آغاز بے بنیاد ہی ہوتا ہے، وہ بغیر کسی وجہ کے دل میں آتی ہیں اور بغیر کسی بنیاد، کسی وجہ کے کسی بڑی عمارت کی طرح تعمیر ہونے لگتی ہیں۔ ذریاب شجاع اس عمارت کی تعمیر تو کر رہا تھا، مگر ساتھ ساتھ اس عمارت کے گرنے کا بھی خدشہ تھا، لیکن وہ اللہ پر یقین کے معاملے میں بہت مضبوط تھا۔ اُسے اچھی طرح خبر تھی، اللہ چاہے، تو ایسی کئی عمارتوں کو ہوا میں معلق رکھے اور کبھی گرنے نہ دے...... وہ چاہے، تو بے بنیاد ہی ایک ایسی دنیا تعمیر کر دے، جس میں ادیوا کی ساری حسرتوں کا مداوا ہو، جس میں اس کی ہر ہر ٹھوکر کے بدلے پھولوں کے باغ اگا دے، جس میں اس کی آنکھ سے بہتے ہر آنسو کو وہ اس کی زیست کے صحرا میں آبشاریں بنا دے۔

وہ تو اللہ ہے نا......! جو چاہے کر دے......

حادی اور ذریاب، ادیوا اور عنائیہ کو ملما کی طرف ڈراپ کر کے گھر

واپس آئے تو آگے ادیوا کی شادی کا ذکر چل رہا تھا۔ مسز عمر، شجاع ماموں اور اُن کی وائف سے ادیوا کے موجودہ رشتوں کا ذکر کر رہی تھیں۔

"بھائی صاحب! کیا بتاؤں ......ایک سے ایک رشتہ اس لڑکی نے ٹھکرایا ہے۔ پتا نہیں کیوں نہیں سمجھتی۔ لڑکیوں کی عمریں نازک ہوتی ہیں، نکل جائے، تو پھر پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں ہاتھ آتا۔"

ذریاب شجاع نے کہا۔

"پھوپھو! ایسے ہی خواہ مخواہ فکر کر رہی ہیں آپ ......اللہ پر بھروسا رکھیں...... کامل بھروسا۔"

"بیٹا! بھروسا تو ہے۔"

"پھوپھو! وہ کامل بھروسا نہیں ہو گا پھر، کیوں کہ جو کامل بھروسا ہوتا ہے نا......! سب سے پہلے آپ کے اندر سے وسوسے دور کرتا ہے اور پھر اس مخصوص چیز کے حوالے سے آپ کے دل میں ایسی لاتعلقی بھرتا ہے کہ اس کا وجود تک آپ کی زندگی سے مٹا دیا جاتا ہے، جب تک کہ وہ مسئلہ حل ہو کر آپ کے سامنے نہ آ جائے اور پھر آپ کو یاد آتا ہے ......اوہ، اچھا! یہ تو وہی مسئلہ تھا جس کے لیے میں نے اللہ پر کامل بھروسا کیا تھا......اب آپ ہی مجھے بتائیں کہ آپ کا بھروسا کامل ہے؟"

مسز عمر لاجواب ہو گئیں اور سب ذریاب کو بہت محبت سے دیکھنے

لگے، کیوں کہ وہ انتہائی عاجز اور شریف لڑکا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ بہت ذہین بھی۔

اب وہ ہانیہ اور حادی کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہو گیا۔

درس کی محفل قرآنِ پاک کی تلاوت سے شروع ہوئی تھی اور اب کچھ دیر نعت خوانی ہوئی اور پھر ڈاکٹر شاہدہ اپنے بیان کے لیے مائیک پر تشریف لائیں۔ اُن کی شخصیت اتنی متاثر کن تھی، کوئی روشنی سی جیسے اپنی طرف کھینچتی ہو۔ ان کی آنکھوں میں نہایت شفقت تو دِکھائی دے رہی تھی اور ساتھ ساتھ ایک ایسا اثر تھا، ایسی مقناطیسی قوت کہ ان کے لفظوں کے لیے بھی دھیان کی سب کھڑکیاں کھل رہی تھیں۔ جس انداز سے وہ دیکھ رہی تھیں اویا کو لگا کہ شاید وہ اُسی سے مخاطب ہیں، مگر یہ بات وہاں بیٹھی شاید ہر عورت کو محسوس ہو رہی تھی۔ اب اُنھوں نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

"السلام علیکم!

مجھے اکثر لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے اندر اندھیرا کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمارے اندر تو اللہ کی محبت ہے۔ ہم تو مسلمان ہیں۔ ہم تو روشن دل والے ہیں۔ پانچ وقت اپنے رب کے آگے سجدہ کرنے والے۔ ہمارے اندر تاریکی نہیں ہے۔

بس اتنی بات مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی۔ اللہ سے محبت ہے اور اُس

کے بنائے ہوئے بندوں سے نہیں؟ یہ کیسی محبت ہوئی کہ کسی کا حق چھین کر، خون بہا کے، لوٹ مار کر کے، اپنے مفاد کے لیے دھوکا دے کے، ہم ذرا بھی ندامت محسوس نہیں کرتے۔ اللہ کی محبت کا اقرار کرتے ہوئے۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہم صرف دعوے دار ہیں محبت کے، ہم عمل سے خالی ہیں اور اسی لیے ہمارے اندر گھپ اندھیرا ہے۔ ہم اللہ سے محبت کے دعوے کو وہاں وہاں پورا کرتے ہیں، جہاں ہمارا اپنا مفاد ہے...... یہ مشروط محبت ہے فائدے سے مشروط۔

اللہ کی محبت حقیقی معنوں میں جن کے اندر ہے، وہ خالی اس کے دعوے دار نہیں۔ ان کے عمل بتاتے ہیں کہ یہ ہیں اللہ والے۔ ان کے دل روشن ہیں۔

اور ہمیں اپنی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہمیں محبت کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے، ہم خالی خولی دعوے دار ہیں بس......

سر تو چاہے پانچ وقت اُس کے آگے جھکا لیتے ہیں مگر دل! کیا دل جھکتا ہے؟ کیا اللہ کو ایک بار بھی ایسے تلاش کیا، جیسے دنیاوی محبتوں کو تلاش کرتے ہیں۔؟؟؟؟

کسی انسان سے محبت کے دعوے میں ہم پھر کھرے نکل آتے ہیں۔ مگر اللہ سے محبت کے دعوے میں محض جھوٹے...... پکے منافق ہیں ہم۔"

اویا کے ذہن پر یہ باتیں مسلسل ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں ......وہ بالکل اسی کرب کو محسوس کر رہی تھی، جو جسم سے روح کے نکلنے سے ہوتا ہے۔اس کی روح پر بھی ندامت کے کوڑے برس رہے تھے کہ اچانک عنائیہ نے ایک سوال اٹھایا۔

"ڈاکٹر صاحبہ! اگر نماز پڑھ کے بھی بے سکونی ہو اور نماز میں بھی دل نہ لگتا ہو، تو اس کی کیا وجہ ہے؟"

اویا جانتی تھی کہ یہ سوال خاص کر اُسی کے لیے اٹھایا گیا ہے۔اب وہ جواب کی منتظر تھی۔

"پھر پہلے آپ اپنے دل کے سکون کی وجہ تلاش کریں۔دیکھیں کہ جہاں وہ سکون محسوس کرتا ہے، وہ اللہ کے بتائے ہوئے قاعدے قانون کے خلاف تو نہیں اور اگر دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں، تو پھر آپ خود فیصلہ کریں کہ آپ کو انتخاب کس کا کرنا ہے۔اللہ کے قاعدے قانون کی خلاف ورزی کر کے نمازوں میں سکون ڈھونڈنا بالکل ایسے ہی ہے کہ ڈاکٹر کی دوا استعمال کیے بغیر شفاء کی اُمید رکھنا۔میں آپ کو مزید سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔"

سوال عنائیہ کا تھا مگر ڈاکٹر شاہدہ کی نظریں اویا عمر پر تھیں اور وہ نظریں اتنی شدید تھیں کہ اُسے لگ رہا تھا کہ وہ اس کے اندر کی کیفیت اور اُس

کی نمازوں میں بے سکونی کی وجہ جانتی ہیں۔ وہ جان گئی ہوں کہ جیسے اس سوال کے جواب کی ضرورت اویا کو ہے۔اُن کی نظریں اُس کی روح کے آر پار تھیں۔

"کیا کبھی آپ نے روحوں کا تڑپنا، چیختا سنا ہے؟ روحوں پہ عذاب کا ذکر پڑھا ہوگا ...... کبھی تجربہ ہوا؟ اپنی نمازوں کے اوقات کسی انسان کی سوچوں میں بیتائے ہیں؟ یقین کریں کہ یہی وہ پل ہوتے ہیں، جب روح چیختی ہے ہمارے اندر، تڑپتی ہے اس پر جیسے کتنے ہی عذاب ایک ساتھ اتر آئے ہیں۔ بے چینی، بے سکونی کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔قرآن میں اللہ پاک فرماتے ہیں کہ۔

"یہی ہیں وہ، جو ظلم کرتے ہیں اپنی جانوں پر۔"

"یہی ہیں گھاٹے کا سودا کرنے والے۔"

انسان کی اوقات جتنی ہو، اتنی ہی محبت اسے دیں۔ اوقات سے بڑھ کے کچھ ملتا ہے، تو قدر نہ ہونا ایک فطری عمل ہے۔

روح کو بس اللہ سے محبت کا جنون بچتا ہے، اُسے کسی انسان کی خواہش میں بھٹکاؤ گے، تو وہ تمھارے جسم کے اندر رہتے ہوئے ہی تم سے انتقام لے گی۔ اسی سے تمھارے وجود کی تذلیل کروائے گی جس کو تم روح پر بوجھ بناؤ گے۔ روحیں اپنا انتقام اس طرح لیتی ہیں، اسی لیے یہ عشق محبت جیسے

جذبات انسانوں پر جائز ہی نہیں......"

ادیوا کو لگا کہ ایک بھی لفظ اور سنا، تو وہ ندامت کے بوجھ تلے دب کے مر جائے گی۔ وہ زار و قطار روتی گئی اتنا شدید کہ اُسے لگا، اگر وہ نہ روتی، تو دل پھٹ جائے گا۔ دنیاوی سہاروں کے لیے انسان کتنا روتا ہے اور وہ اُسے روتا دیکھ کر کنارا کرتے ہیں۔ انسان اللہ کے لیے ایک آنسو بھی بہائے، تو اللہ اُسے اگلا ایک آنسو بھی اور رونے نہیں دیتا۔

یہ ہوتا ہے مضبوط سہارا......

ڈاکٹر شاہدہ اُٹھ کے ادیوا کے پاس آئیں، جو روئے چلی جا رہی تھی۔

"بیٹا! اب یہ آنسو جائز آنسو ہیں۔ اب یہ ٹھیک وجہ سے بہہ رہے ہیں۔ میں آپ کو نہیں روکوں گی...... آپ جی بھر کے رو لو...... لیکن اب آپ نے کسی ایسے سکون سے وابستہ نہیں ہونا، جو اللہ کے قانون کے برعکس ہو...... اس کی محبت سب سے بڑا سہارا ہے...... اپنے دل کو اللہ کے نور سے روشن کرو، مٹی کے پتلوں کی پرستش تباہی ہے سراسر تباہی......"

ادیوا عمر کا دل اب کسی انسان کی محبت کے آسیبی اثرات سے بالکل پاک ہو چکا تھا۔ اب وہاں سے وحشتیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی تھیں۔

مایوسی گناہ ہے، کا مفہوم اب ادیوا کو بالکل سمجھ آ چکا تھا۔

اویا اور عنائیہ خوشی خوشی گھر آئیں اور اویا نے آتے ہی اپنے کمرے کی بالکونی سے پردے پیچھے کیے۔روشنی کو اندر آنے کا راستہ دے دیا۔اپنے اردگرد ہی نہیں اپنے اندر بھی زندگی کے آثار محسوس کیے...... سچ ہے کہ کچھ محبتیں روح پہ بوجھ ہوتی ہیں اور بے شک وہ دنیاوی محبتیں ہی ہیں۔

اس نے شکرانے کے نفل ادا کیے اور اس وقت اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ایک سکون تھا، ایک کیفیت تھی، ایک حصار تھا، جو اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔اب وہ محفوظ تھی، کیوں کہ اللہ کی پناہ انسان کی سب سے مضبوط ڈھال ہے۔

اویا کو عنائیہ کی بات یاد آتی رہی کہ علم جہاں سے بھی ملے لے لو اور دین کا علم...... وہ واقع ہی بہت نفع بخش علم سے مستفید ہوئی تھی۔

اویا کی مسکراہٹوں سے گھر پھر سے گونج اُٹھا تھا۔ہنستی کھیلتی وہ وہی اویا تھی، جو معصوم تھی...... لیکن اب وہ mature تھی......

اگلے دن سب مل کر اسلام آباد گھومنے گئے۔ پہلے فیصل مسجد اور پھر دامنِ کوہ۔واپسی پہ آتے ہوئے اویا اور عنائیہ سپر مارکیٹ رُکیں، ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور سے شاپنگ کرتے ہوئے اویا جیسے ہی کاؤنٹر کی طرف مڑی، تو سامنے صفان علی تھا۔اپنے بیٹے کو اٹھائے ہوئے اپنی بیوی سعدیہ کے ساتھ......

یہ وہی انسان تھا، جو کبھی نظر سے گزرتا، تو دھڑکنیں تھم جایا کرتی تھیں ۔بات کرتا، تو سماعتیں گھنٹوں اُسی کو سنتی رہتی اور اگر ساتھ چلتا، تو اپنی قسمت پر ناز ہونے لگتا۔آج سامنے کھڑا تھا بالکل ایک غیر اہم انسان کی طرح۔آج اُسے دیکھ کر دھڑکنوں میں وہ ٹھہراؤ نہیں تھا۔آج اُس کے منہ سے ایک بھی لفظ سننے کی تمنا نہیں تھی اور اگر وہ آج ساتھ ایک قدم بھی اٹھاتا، تو ساری مسافتیں اذیتیں دینے لگتی۔

ادیبا ایک پل کے لیے بس اُسے دیکھتی گئی۔۔اُس میں کیا ایسی خاص بات تھی؟ وہ کتنا عام سا انسان تھا اور کتنی بے رحمی سے اُس کے کانچ سے نازک خواب توڑتا چلا گیا......

انسان محبتوں کے بکھیڑے نہ پالے، تو زندگی میں وہ سکھ دیکھنا بھی نصیب ہو جاتا ہے، جو قسمت والوں کو بھی نہیں ملتا۔

وہ بہت پُروقار طریقے سے اُس کے سامنے سے گزری اور اگر وہ اُسے یوں گزرتا دیکھ لیتا، تو شاید بہت سے پچھتاؤں کا شکار ہو جاتا۔اُسے عنائیہ کی بات یاد آئی۔

"اب وہ واقعی ہی اُس کے لاشعور سے بھی نکل گیا تھا۔"

ادیبا نے کبھی اُس انسان کو بددعا نہیں دی تھی، اس لیے اسے مکمل زندگی گزارتا دیکھ کر اُسے دکھ بھی نہ ہوا تھا، کیوں کہ جو چیز اللہ نے ادیبا کو عطا

کروی تھی، وہ صفان کی مکمل زندگی سے کہیں بڑھ کر تھی۔

"جو لوگ بد دعائیں دیتے ہیں، وہ اللہ کے انصاف پر، بھروسے میں کمزور ہوتے ہیں، کیوں کہ جب اللہ کی عدالت میں معاملہ رکھ دیا، تو پھر یقیناً فیصلہ انصاف کا ہی ہوگا۔ کبھی بھی جج ملزم کو مظلوم سے پوچھ کے سزا نہیں سناتا۔"

"اودیوا! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" مسز عمر اُس سے مخاطب ہوئی۔

"جی...... ماما جانی! کہیں پلیز۔"

یہ وہی اودیوا تھی، محبت سے، اخلاق سے بھری، وہی عاجزی، وہی دھیما پن اُس کے سب خزانے اُسے واپس لوٹا دیے گئے تھے۔

"تمھاری ممانی اور ماموں نے ذریاب شجاع کے لیے تمھارا ہاتھ مانگا ہے۔ اگر تم مان جاؤ، تو وہ جانے سے پہلے نکاح کر کے جانا چاہتے ہیں تا کہ ذریاب تمھیں ساتھ لے جائے۔"

"ماما! آپ اور پاپا جیسے مناسب سمجھیں...... میں آپ کے ہر فیصلے میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

دنیا میں سچی اور بے لوث اگر کوئی محبت ہے، تو وہ ماں باپ کی ہے۔ وہ کبھی اپنے بچوں کے لیے غلط فیصلہ نہیں کرتے......

مسز عمر کو یہ سن کے بہت خوشی ہوئی اور انھوں نے ادیبا کا ماتھا چوما اور اُسے گلے لگالیا۔

ادیبا جانتی تھی کہ ذریاب شجاع میں باقی باتیں تو اچھی تھیں ہی، لیکن ایک بات جو ہر لحاظ سے نمایاں تھی، وہ یہ کہ اُس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف تھا اور جس دل میں اللہ کا خوف ہو، وہ اپنا آپ توڑے، تو توڑے، مگر کسی دوسرے کا دل نہیں توڑ سکتا، کسی بھی صورت میں نہیں۔

جو انسان جانوروں کی تکلیف سے تڑپ جائے، وہ ممکن ہی نہیں کہ کسی انسان کو کانٹا چبھنے جتنی تکلیف بھی دے سکتا ہو۔

☆☆☆

آج وہ سب مری میں تھے۔ ذریاب اور ادیبا ایک پہاڑ کی چوٹی پر تھے، جہاں آس پاس چھوٹے بڑے خوبصورت گھر تھے۔

"ذریاب! پہاڑوں پر گھر......"

ذریاب اس کی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"تمھیں بہت پسند ہے نا ادیبا!"

ادیبا، ذریاب کو دیکھ کے مسکرائی اور وہ اُس کا ہاتھ تھامے دُور تک چلتا گیا......

التجائیں کبھی بھی بے ظرف لوگوں سے نہیں کی جاتی......' پتھر کر دو آنکھ میں آنسو' ایک ایسی ہی التجا تھی، جو اس بے پناہ شانوں والے رب سے کی گئی تھی، جو دینے پہ آتا ہے، تو بندے کی اوقات نہیں دیکھتا، اعمال نہیں دیکھتا، بس عطا کرتا ہے اور ادیوا کو عطا کیا جا چکا تھا۔ وہ آنسو جو آنکھ سے بہتا رہا تھا، جو آنکھوں کی روشنائی لے گیا تھا......اب وہ آنسو پتھر کر دیا گیا تھا اور اُس کی بینائی لوٹا دی گئی تھی۔

سچ کہتے ہیں کہ خدا سے جیسا گمان رکھو گے، اُسے ویسا ہی پاؤ گے......اپنی نیت سے فتور نکل جائے، تو تاریک رستوں پہ چل کے بھی پُرنور منزل مل جاتی ہے اور اگر سرابوں میں بھٹکنے کی خواہش ہو، تو بینائی بھی چھن جاتی ہے اور اپنے مالک سے آشنائی بھی۔

☆......☆......☆

https://www.facebook.com/Pathar-Kar-Do-Ankh-Mein-Ansu-408548209331097/